

ادھوری زندگانی

لعل خان

پاکستانی پبلسٹ ڈاٹ کام

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔

www.pakistanipoint.com

ادھوری زندگانی

لعل خان



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔

www.pakistanipoint.com

ادھوری زندگانی

کتابی شکل: پاکستانی پوائنٹ کمپوزنگ ٹیم



پاکستانی پوائنٹ کوئی تجارتی ویب سائٹ نہیں ہے یہاں پر موجود ناولز بالکل مفت ہیں۔ اس مشن کا مقصد صرف اردو ادب کی خدمت کرنا ہے تاکہ جو لوگ وطن سے دور ہیں اور اردو کتب حاصل نہیں کر سکتے، وہ یہاں سے ڈاؤنلوڈ کر لیں۔ اگر آپ اردو لکھنا جانتے ہیں تو آپ بھی روز کا ایک صفحہ کمپوز کر کے اس مشن کا حصہ بن سکتے ہیں۔ مزید معلومات کے لئے، سپر موڈز: صبا گل، تلی، ٹیم لیڈر: ایم وائے صائم، مینجمنٹ: حبیب یاد قار سے رابطہ کریں، شکریہ



تین جنوری بروز منگل (2013ء)

شام کے سائے لمبے ہو کر اب گھر کی کچی دیواروں کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ سورج اپنی آب و تاب کھو کر بچی کھچی روشنی کو دیواروں کی منڈیر سے بس کھینچنے ہی والا تھا۔ میں نے صحن کے بیچوں بیچ لکڑی کی چارپائی پر دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر لیٹے ہوئے اباجی کی طرف دیکھا، وہ آسمان کی جانب دیکھ رہے تھے۔ شاید موازنہ کر رہے تھے اپنا اور آسمان کا۔ آسمان چھیا سٹھ برس پہلے بھی اسی طرح تھا، تاحد نظر پھیلا ہوا... رات کے آنگن میں ستاروں سے سبھی ہوئی دلہن کی طرح اور بنا سہارے کے کھڑا ہوا مگر ان چھیا سٹھ برسوں نے اباجی سے بہت کچھ چھین لیا تھا۔ بچپن، جوانی اور اب صحت بھی۔ وہ بیمار بیمار سے رہنے لگے تھے۔

دن مٹی سے بنے ہوئے کچے گھر کے چھوٹے سے کمرے میں لٹکے میلے کچیلے تین پروں والے پنکھے کو گھورتے ہوئے گزار دیتے تھے اور رات ستاروں کی گنتی میں... مگر ان کی یہ گنتی ہر رات ادھوری رہ جاتی تھی۔ ستاروں کی چمک ماند پڑتے پڑتے مر جاتی اور سورج تازہ دم ہو کر لوٹ آتا تھا۔ تب اباجی چارپائی اٹھا کر پھر سے کمرے میں گھس جاتے۔ میں نے نظروں کا رخ بدلا تو سامنے لکڑی کے بیرونی دروازے کے دائیں طرف جلتے ہوئے تندور میں تندہی سے روٹیاں پکاتی اماں نظر آئیں۔ اماں کا چہرہ بھی تندور کی تپش سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ

کندھے پر مفکر کی طرح ڈالے گئے دوپٹے نما کپڑے سے بار بار چہرہ صاف کرتی اور پھر سے تندور پر جھک جاتیں۔

”کاش! میری کوئی بہن ہوتی۔“ بے اختیار ہی دل نے اک اور کاش کو جگہ دے دی۔ میں اماں اور ابا کی اکلوتی اولاد تھا جسے دونوں نے بہت لاڈ پیار سے بڑا کیا تھا۔ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے والے میرے ماں باپ نے میری چھوٹی سی خواہش کو بھی اپنی جان گروی رکھ کر پورا کیا تھا۔ ابا بتاتے ہیں ان کی شادی کے آٹھ سال بعد جب میں پیدا ہوا تو انہوں نے اپنی ساری زمین بیچ کر یہ مٹی کا گھر بنایا تھا تاکہ ان کے شہزادے کو اس جھونپڑے میں نہ رہنا پڑے جس میں اباجی کی ماں کو بیاہ کر لائے تھے۔ وہ جھونپڑا ابا کی زمین میں ہی بنا ہوا تھا اور وہاں کھیتی باڑی کر کے وہ اپنا اور اماں کا پیٹ پالتے تھے۔ زمین بک جانے کے بعد ان کے شہزادے کو گھر تو مل گیا مگر اس کے بعد ابا کونت نئے لوگوں کے آگے مزدوری کر کے اپنا گھر چلانا پڑا لیکن وہ یہ سب بہت خوشی خوشی برداشت کر رہے تھے۔ میری آمد نے ان کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے صحرا میں مجھے ایک نوخیز پودا سمجھتے تھے جس نے ایک دن سایہ دار درخت بن کر انہیں اپنی چھاؤں میں پناہ دینی تھی۔

اماں بتاتی ہیں جب میرا نام رکھنے کا مرحلہ آیا تو دونوں میں خوب لے دے ہوئی۔ اماں نے میرے لیے اپنے مرحوم بھائی پرویز کا نام سوچا ہوا تھا اور ابا مجھے گلزار کہہ کر بلانا چاہتے تھے۔

یوں کئی دن تک یہ جھگڑا چلتا رہا اور آخر کار دونوں نے تیسرا رستہ نکالا اور میرا نام پرویز گل رکھ دیا گیا۔

ابتدائی پانچ سال تک ابا کی دہاڑی سے گھر بھی چل جاتا اور میرے خمرے بھی آرام سے برداشت ہو جایا کرتے تھے مگر جب مجھے اسکول میں داخل کروانے کا وقت آیا تو ابا اور اماں دونوں ایک بار پھر متفکر ہو گئے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کروں تاکہ جو ان ہو کر ابا کی طرح دہاڑی کرنے کی بجائے کوئی بڑا افسر بنوں گا اور میری جوانی اور اُن کا بڑھاپا سدھر جائے، مگر اب جب میں پانچ سال کا ہو کر ان سے پوچھ رہا تھا کہ میں کب اسکول جاؤں گا، تو دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے تھے۔

تب پہلی بار اماں نے ابا کا ساتھ دینے کے لیے کمر کس لی اور محلے کے وہ تمام گھر جہاں جھاڑو پونچھے اور برتن دھونے کے لیے نوکرانیوں کی ضرورت پڑتی تھی وہاں پہنچ گئیں اور آخر کار ایک گھر میں انہیں نوکری مل ہی گئی۔ یوں اب گھر کا خرچہ ابا کے ذمے ہو گیا اور میری پڑھائی کا خرچ اماں کے ذمے۔ اماں روز مجھے ناشتا کروانے کے بعد گاؤں کے واحد پرائمری اسکول میں چھوڑنے کے بعد اپنے کام پر چلی جاتی اور جب چھٹی کا وقت ہوتا تو ابا مجھے لینے آ جایا کرتے۔ یوں زندگی کی گاڑی اپنی ڈگر پر چل پڑی۔ میرے آنے کے بعد ہماری فیملی مکمل ہو گئی تھی۔ ابا، اماں اور میں۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب میں نے میٹرک میں اپنی کلاس

میں دوسری پوزیشن لی تھی۔ اس دن ابا نے ایک بار پھر اپنی ساری جمع پونجی لگا کر پورے محلے میں مٹھائی بانٹی تھی۔

میٹرکولیٹ ہونے تک مجھے اس بات کا اچھی طرح ادراک ہو چکا تھا کہ میں ایک لوئر مڈل کلاس فیملی کا لڑکا ہوں۔ میرے ابا دہاڑی کرتے اور اماں لوگوں کے گھروں میں کام کاج کرتی ہیں۔ میں اب اپ سیٹ رہنے لگا تھا۔ مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ میں مزے سے رہوں اور میرے ماں باپ محنت مزدوری کر کے میرا پیٹ بھرتے رہیں۔ اسی لیے میں نے سوچ رکھا تھا کہ میٹرک پاس کرتے ہی کوئی کام ڈھونڈنا شروع کر دوں گا۔ جب میں نے ابا اور اماں سے بات کی تو دونوں کا غصہ آسمان چھونے لگا۔ وہ مجھے کسی بھی صورت پڑھائی چھوڑ کر کام پر لگنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ ابا نے اس دن پہلی بار مجھے شدید غصے میں انگلی اٹھا کر وارننگ دیتے ہوئے کہا:

”کان کھول کر سن لو گل! پڑھائی چھوڑ کر کام کا خیال دوبارہ دل میں کبھی مت لانا۔ میں نے تمہارے لیے کچھ خواب دیکھے ہیں اور وہ تب ہی پورے ہوں گے جب تم تعلیم مکمل کر کے افسر بن جاؤ گے۔ میں ابھی بوڑھا نہیں ہوا تم سے زیادہ طاقتور ہوں۔ میں تمہاری پڑھائی کا خرچ برداشت کر لوں گا۔“ ابا کی بات ختم ہوتے ہی اماں بھی مجھ پر برس پڑی تھیں۔

”تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ ہم دونوں کے ہوتے ہوئے تم پڑھائی چھوڑ کر کام پر کرو گے۔ تمہیں ابھی اور پڑھنا ہے جیسے وہ خالد صاحب کا بیٹا پڑھ رہا ہے شہر جا کر۔ تم بھی شہر جا کر پڑھو گے اور تب تک نہیں لوٹو گے جب تک بڑے افسر نہ بن جاؤ۔“

یہ سنتے ہی ابانے اماں کو ڈپٹ دیا تھا۔

”تم بھی کمال کرتی ہو نیک بخت! کیوں نہ لوٹے، ہزار بار لوٹے، اس کا گھر ہے یہ مگر صرف چھٹیاں گزارنے کے لیے، دھاڑیاں کرنے کے لیے نہیں۔“

میں خاموشی سے سر جھکائے اپنے ماں باپ کی باتیں سن رہا تھا جن کے غصے میں بھی میرے لیے پیار کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔

مجھے ان کی سادہ لوحی پر رشک بھی آتا تھا۔ یہ صرف اتنا جانتے تھے کہ ڈھیر سارا پڑھنے سے لوگ بڑے افسر بن جاتے ہیں مگر میں جانتا تھا صرف ڈھیر ساری پڑھائی افسر بننے کے لیے کافی نہیں ہوتی۔

وہ مجھے ڈاکٹر، انجینئر یا وکیل نہیں بنا سکتے تھے۔ ان کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ مجھے ایم بی بی ایس یا ایل بی کروا پاتے، مگر میں ان کی امیدوں کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے میں نے سوچ رکھا تھا کہ میں شہر جا کر پڑھائی کے ساتھ ساتھ پارٹ ٹائم جاب کروں گا تاکہ میں ان پر بوجھ نہ بنوں۔ مگر اللہ کی زمین میں صرف وہی ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ ہم انسان

صرف منصوبے بنا سکتے ہیں۔ بہ قول اشفاق احمد... ”انسان اتنا غافل منصوبہ ساز ہے جو اپنی موت کو اپنے منصوبے میں شامل ہی نہیں کرتا۔“ میرے منصوبوں کے راستے میں موت تو حائل نہ ہو سکی، مگر ابا کی اچانک بیماری نے ان کے تمام خواب چکنچور کر دیے جو انہوں نے میرے لیے دیکھے تھے۔

میرے شہر جانے کے ڈیڑھ سال بعد ہی ابا کو ایسی بیماری لگی کہ وہ چارپائی کے ہو کر رہ گئے۔ اماں اکیلی ابا کو سنبھال نہیں سکتی تھیں، چارونا چار مجھے انٹر ادھورا چھوڑ کر گھر واپس آنا پڑا۔ گھر کے اخراجات کے ساتھ ساتھ اب مجھے ابا کی بیماری سے بھی لڑنا تھا جو مناسب علاج نہ ہونے کی وجہ سے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ابانے بولنا تقریباً چھوڑ ہی دیا تھا۔ وہ اپنی شکست کے احساس کے ساتھ روز بہ روز زندگی سے مایوس ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے ابا کی جگہ دھاڑی لگانا شروع کر دی۔ اماں ابھی تک محلے کے کچھ گھروں میں جھاڑ پونچھ کر کے تھوڑا بہت کما رہی تھی مگر ہم ماں بیٹے کی کمائی گھر کو چلانے اور ابا کو چارپائی سے اٹھانے کے لیے ناکافی تھی۔ میں شہر جا کر اچھی نوکری ڈھونڈنا چاہتا تھا مگر ابا کی حالت نے میرے پاؤں میں زنجیر ڈالی ہوئی تھی۔ مجھے دھاڑی پر کام کرتے تین سال ہو چلے تھے لیکن ابا کی حالت نہ سدھر سکی اور اب اماں بھی کام کے لائق نہ رہی تھیں۔ میں نے خود ہی ان سے کہہ کر کام چھڑوا دیا تھا۔ ابا کو شاید اب علاج کی ضرورت نہ رہی تھی اور مز دوری کرنے سے دو وقت کی روٹی کا

بندوبست ہو ہی جاتا تھا۔ میں نے خود کو وقت اور حالات کے سپرد کر دیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ میرا امتحان میری غریبی لے رہی ہے۔ مجھے اب بس اس وقت کا انتظار تھا جب ابانے چارپائی چھوڑنی اور شاید قبر میں سونا تھا۔

☆...☆...☆

تین جنوری بروز منگل (2013ء)

کراچی دنیا کے چند بڑے شہروں میں سے ایک شہر، جسے انسانوں کا جنگل کہنا قطعاً غلط نہ ہو گا اور انسانوں کا یہ جنگل ہر طرح کے انسانوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں قانون بھی جنگل کا چلتا ہے۔ کم زور کو بھنبھوڑ لیا جاتا ہے، طاقت ور کے پاؤں چاٹے جاتے ہیں یا دم دبا کے بھاگ لیا جاتا ہے۔ یہاں شہنشاہ بھی رہتے ہیں اور ان کے محلوں کے پچھواڑے فقیروں کی جھگیاں بھی نظر آتی ہیں۔ مگر یہ شہنشاہ ان جھگیوں سے بے نیاز ہی رہتے ہیں۔

ایسے ہی ایک بے نیاز شہنشاہ کے تین منزلہ محل کو آج دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ مین روڈ پر چلتی ہوئی گاڑیوں میں بیٹھے ڈرائیورز دور ہی سے محل کی چمک دمک دیکھ کر گنگ ہو رہے تھے۔ رات کے دامن میں جانے کب سے تاروں نے پناہ لے لی تھی۔ شہر کی روشنیاں

دیکھ کر آسمان بھی اپنی سجاوٹ پر جربز ہو رہا تھا مگر اس پل مہراں اسٹریٹ سے گزرنے والی ہر گاڑی میں بیٹھے اور پیدل چلنے والے شہر کی روشنیوں کو بھول کر نیلی چھتری کی تاروں بھری سجاوٹ نظر انداز کر کے بس اسی بے نیاز شہنشاہ کے محل کی چمک دمک میں کھوسے گئے تھے۔

یہ محل آج یونہی نہیں سجایا گیا تھا بلکہ اس محل میں شہنشاہ اپنی اکلوتی بیٹی جو شہزادیوں سے زیادہ آن بان رکھتی تھی، کے ساتھ رہتا تھا اور اسی شہزادی کی زندگی کے انیس سال پورے ہونے میں بس چند منٹ رہ گئے تھے۔

یہ عالی شان جشن شہزادی کی انیسویں سالگرہ منانے کے لیے تھا۔

یہ روشنیاں، یہ رنگ، اور یہ سنگار... رانی کی زندگی کی انیس بہاریں پوری ہو جانے کے لیے ہوا تھا۔

رانی... شہر کے مشہور بزنس مین سیٹھ کریم کی واحد اولاد تھی۔ اس کا پورا نام رانیہ کریم خان تھا پر اسے صرف رانی ہی پکارا جاتا تھا اور اس پر یہ نام سوٹ بھی کرتا تھا۔ وہ رانیوں سے بڑھ کر تھی۔ صورت بھی رانیوں جیسی۔ اسے نصیب بھی رانیوں جیسا۔

پر یہ رانی بہت عجیب تھی۔ صورت اور نصیب کی بلندیوں سے بے نیاز... یا بے خبر۔ دنیا کے رسم و رواج سے انجان۔ نہ مغرور۔ نہ مشکور۔ مگر وہ ناشکری بھی نہیں لگتی تھی۔ خاموش رہتی تھی۔ الگ تھلگ...

جیسے اسے اس دنیا سے اور اس کی رنگینوں سے کوئی مطلب نہ ہو۔

دنیا سے اپنی طرف کھینچ نہیں پاتی تھی۔ مگر دنیا اس کے پیچھے کھینچی چلی آتی تھی۔

اس کے باپ کے امیر کبیر دوستوں کی بگڑی ہوئی اولادیں جن کی صبح نازخروں سے شروع ہوتی اور رات موج مستی میں ختم ہوتی تھی۔ مگر رانی کو دیکھتے ہی ان کے نخرے جانے کہاں چلے جاتے تھے؟

وہ اسے دیکھتے ہی بھول جاتے تھے۔ اپنی اوقات... اپنا معیار۔ مگر رانی کو پروا نہ تھی۔ جیسے آج بھی نہ تھی۔

محل کے لان میں رونقیں اس وقت اپنے عروج پر تھیں۔ سیٹھ کریم کے سارے دوست احباب اور خاندان کے لوگ اپنی فیملیز کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ ہنسیاں پھوٹ رہی تھیں، قہقہے لگ رہے تھے مگر ان قہقہوں میں چھپی ہوئی غرض کی بدبو آسانی محسوس کی جا سکتی تھی۔ آج بڑا دن تھا۔ بڑا موقع۔ ہر کوئی سیٹھ کریم سے اپنے بیٹوں کا تعارف کروا رہا تھا۔

”ان سے ملیے سیٹھ صاحب! ہمارے صاحب زادے ہیں۔ ابھی حال ہی میں امریکا سے اپنی تعلیم مکمل کر کے آئے ہیں۔ بھئی میں نے تو صاف کہہ دیا ہے ان سے، بزنس اپنی مرضی کا شروع کر لو مگر... شادی تو تمہاری میں اپنی مرضی ہی سے کروں گا۔“ ہمدانی صاحب نے بے وجہ قہقہہ لگایا اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولے:

”بھئی اپنی رانی نہیں نظر آرہی... ان سے ملو ادیس صاحب زادے کو۔“ سیٹھ کریم نے بس مسکرا کر پراکتفا کیا تھا۔ وہ جانتے تھے اس وقت سب نظریں ایک ہی وجود کو تلاش کر رہی ہیں۔

بارہ بجنے میں وقت بہت کم بچا تھا مگر رانی کا کہیں کچھ پتا نہیں تھا۔ اُن کا بلڈ پریشر حسب معمول بڑھنے لگا تھا۔

ان کی کلاس میں ایک دوسرے کے معاملات میں گھسنے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ وہاں ہر کوئی چوبیس گھنٹے اپنی مرضی سے جی سکتا تھا اور ان کے گھر میں تھے ہی کتنے لوگ...؟ اک وہ اور دوسری رانی۔

رانی چار سال کی تھی جب اس کی ماں نے اس کے باپ سے طلاق لے کر کینیڈا شفٹ ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اس کے باپ کی خالہ زاد تھی اور بزنس میں بھی برابر کی حصے دار۔ کینیڈا میں بزنس ٹرپ کے دوران اسے کوئی اور پسند آگیا۔ واپس آکر اس نے سیٹھ کریم کو اپنے

فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ سیٹھ کریم کی اپنی دل چسپیاں تھیں۔ اسے چھ سال پرانی بیوی اور چار سالہ بچی کی ماں سے کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی۔ نتیجہ وہی نکلا جو اس طرح کی صورت حال میں نکلتا ہے۔ طلاق کے پیپر زپر سائن کرتے وقت دونوں کے دل میں کہیں بھی چار سال کی رانی نہیں تھی۔ اس کے باپ کو اس کی پرورش کے لیے ایک ماں کی ضرورت کی فکر سے زیادہ اپنی سرگرمیوں سے دل چسپی تھی اور اس کی ماں کو اس سے زیادہ اپنے کینیڈین محبوب کی فکر... بچی کو باپ کے سپرد کرنے کا فیصلہ بھی اس کی ماں کا تھا۔ وہ چار سالہ رانی کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے کینیڈا چلی گئی اور پچھلے پندرہ سال میں رانی کے لیے شاید پندرہ فون آئے ہوں گے اس کے۔

رانی کے باپ نے اُس کی پرورش کے لیے وہی کیا جو اس جیسی سوچ رکھنے والا کوئی بھی کروڑ پتی باپ کر سکتا ہے۔ اس نے اسے نوکروں کی فوج کے حوالے کر دیا۔ رانی کو اٹھانے کے لیے الگ، سنانے کے لیے الگ، نہلانے کے لیے الگ اور کھلانے پلانے کے لیے الگ الگ نوکر نوکرانیاں رکھ دیں مگر رانی پھر بھی سنبھالے نہ سنبھلتی۔ وہ باپ کو دیکھتے ہی چیخ کر اس کی طرف دوڑ پڑتی، ماں سے ملنے کے لیے مچل جاتی مگر وہ بے نیازی سے اسے گھر کے کسی بھی نوکر کے حوالے کر کے اپنے کمرے میں گھس جاتا اور پھر اگلے دن گھر سے نکلتے ہوئے ہی نظر آتا۔ رانی رات رات بھر نوکروں کے جھر مٹ میں گھری کبھی ماں کے لیے تڑپتی اور

کبھی پوری پوری رات جاگ کر باپ کے لوٹنے کا انتظار کرتی مگر اس کا باپ اکثر رات بھر باہر ہی رہتا اور اگر کبھی واپس آ بھی جائے تو صرف ایک ”ہائے کوئین“ کے علاوہ اس سے کوئی بات نہ کرتا اور رانی ترستی ہی رہ جاتی۔

وقت کے ساتھ ساتھ رانی کی تڑپ تبدیل ہو کر ایک خاموشی کا روپ دھار گئی اس نے خاموشی اور بے نیازی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔

نوسال کی عمر سے اس نے اپنی ماں اور باپ کا انتظار کرنا چھوڑ رکھا تھا۔ اب اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ ماں کا فون کتنے ماہ بعد آیا اور باپ نے اسے کتنے ہفتوں بعد اپنی صورت دکھائی۔ وہ اپنی عمر کے بچوں کو ماں اور باپ کے بیچ ان دونوں کی انگلی تھام کر چلتے دیکھتی تو جیسے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان اٹھ آتا۔ اس کے اندر ماں اور باپ کے پیار کو ترسی بچی دھاڑیں مار مار کر رونے لگتی مگر اس تڑپ کو اس نے خاموشی کے لبادے میں اوڑھ لیا تھا۔ وہ اپنی زندگی کی کسی بھی اسٹیج پر نارمل نہیں رہ سکی۔ اسکول، کالج اور اب یونیورسٹی میں بھی اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ ایک کروڑ پتی باپ کی اکلوتی بیٹی کے اس رویے کو ہر کوئی اس کا غرور سمجھتا تھا، مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس خاموشی کے پیچھے وہ کمپلیکس چھپا ہوا ہے جس نے اسے اس دنیا سے اور اس کی ہر خوبصورت اور دلچسپ شے سے بے زار کر دیا تھا۔ وہ اپنے خول میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ کوئی نہیں تھا جسے وہ اپنے دل کی بات بتا سکتی اور

کوئی نہیں تھا جو پہلی نظر میں جان جاتا کہ وہ اندر سے کتنی ویران اور خالی ہے۔ اس کی خود سے اور رشتوں سے لاتعلقی کا پہلا نوٹس اس کے باپ نے تب لیا جب وہ چودہ سال کی تھی۔ وہ رات گئے گھر لوٹ کر اپنے کمرے میں گھسے اور حسبِ عادت ٹی وی آن کیا اور ٹی وی آن ہوتے ہی ایک خبر ان کی منتظر تھی۔

”میٹرک میں پورے کراچی سے ٹاپ کرنے والی رانیہ کریم خان کو وزیرِ تعلیم نے آج ان کے اسکول میں میڈل سے نوازا۔“

اور ساتھ ہی متعلقہ ویڈیو چلائی گئی جس میں وزیرِ تعلیم اپنے ہاتھوں سے اس کی بیٹی کو میڈل دے رہے تھے۔

”واؤ!“ بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔

”یہ تو بہت بڑی نیوز ہے، سیلیبریٹ کرنا چاہیے۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔ پھر ایک جھٹکے سے رک گئے۔

”اس نے تو مجھے بتایا ہی نہیں کہ آج اس نے اتنی بڑی اچیومنٹ کی ہے؟“ وہ دل ہی دل میں سوچ کر تھوڑی دیر کے لیے رک سے گئے تھے، اگلے ہی لمحے ان کے قدم پھر سے رواں ہو گئے۔

رات بارہ بجے رانی کے دروازے پر ٹک ٹک کی آواز آئی۔ وہ جاگ رہی تھی مگر اس آواز کی عادی نہیں تھی۔ پچھلے دس سالوں سے اسے جگانے کی ڈیوٹی فاطمہ نام کی ایک ملازمہ کی تھی جسے وہ فاطمہ آنٹی کہہ کر بلایا کرتی تھی۔

ایک بار باپ کے سامنے کہہ بیٹھی تھی تو وہ جو ہاتھ میں بریف کیس لیے اسے ”ہائے کوئین“ کہنے والے تھے، فوراً ایک غصے بھری نگاہ سے اسے گھور کر بولے۔

”وہ آپ کی آنٹی نہیں ملازمہ ہے۔ آئندہ اسے آنٹی کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اوکے؟“

”مگر پاپا... وہ مجھے بیٹا کہتی ہیں۔“ حیران حیران سی وہ پاپا کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”اٹس اوکے! میں اُسے سمجھا دوں گا۔ آئندہ وہ آپ کو چھوٹی مالکن کہہ کر بلایا کرے گی۔“ وہ اپنی بات پوری کر کے آگے بڑھ گئے اور رانی نا سمجھی میں انہیں پیچھے سے جاتا دیکھ رہی تھی۔

اس کے بعد وہ تو فاطمہ کو فاطمہ آنٹی ہی کہتی تھی، مگر فاطمہ کے لیے وہ چھوٹی مالکن بن چکی تھی۔ فاطمہ کے پاس اس کے کمرے کی چابی موجود تھی۔ وہ صبح اسے اٹھانے کے لیے دروازہ کھول کر اندر آ جایا کرتی تھی۔

رانی کے کان ٹک ٹک کی آواز سے نامانوس تھے۔

آواز دوبارہ آئی۔ اس نے کمبل ہٹایا اور سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔

”کون ہے؟“ اس کی آواز میں تعجب نمایاں تھا۔

اور باہر کھڑا اس کا باپ فرط حیرت میں ڈوبی اس آواز کو سن کر زندگی میں پہلی بار نروس ہوا تھا۔ اک لمحے کے لیے انہوں نے سوچا کہ واپس ہولیں۔ ان کے قدم آہستہ سے پیچھے ہٹے اور وہ واپس پلٹ ہی چکے تھے۔ مگر دوسرے ہی لمحے انہیں رکتا پڑا۔ دروازہ کھل چکا تھا اور پھر حیرت سی حیرت لیے رانی کی آواز آئی۔

”پاپا!“ انہیں واپس پلٹنا پڑا۔

سامنے دروازے کے بچوں بیچ ان کی اکلوتی بیٹی کھلے ہوئے بالوں اور سرخ آنکھیں لیے کھڑی تھی۔

یہ سرخ آنکھیں اس کے رت جگوں کی غماز تھیں۔ اسے نیند بہت کم آتی تھی۔ وہ جب بھی آنکھ بند کرتی تو اس کے دماغ کے پردے پر تصویریں بننے لگ جاتیں۔ ہنستے مسکراتے ہوئے بچوں کی تصویریں جو اپنے ماں باپ کے ساتھ کبھی پارک میں ٹہل رہے ہیں تو کبھی جھولا جھول رہے ہیں۔ کبھی پیرنٹس ڈے پر اپنے بچوں کی انگلی تھامے بڑے فخر سے ٹیچرز کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں۔ کبھی کوئی باپ اپنے بچے کو ہوا میں اُچھالتا ہے، تو کبھی کوئی ماں اپنی بچی کے پیچھے بچوں کی طرح بھاگ کر اسے پکڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ اسے بچوں کی وہ

خوشی اور زندگی سے بھرپور قلقاریاں بھی سنائی دیتی تھیں جو دن میں اکثر وہ سنتی رہتی تھی۔ تب ہی سو نہیں پاتی تھی۔

سیٹھ کریم نے سالوں بعد غور سے اپنی بیٹی کا چہرہ دیکھا تھا جو اس وقت حیرت کے سمندر میں ڈوبی سرخ آنکھوں کے ساتھ منہ کھولے اپنے باپ کو تنکے جارہی تھی جیسے وہ اس کا باپ نہیں کسی دوسرے سیارے سے آئی ہوئی کوئی مخلوق ہو۔

”اہم...“ وہ ہاتھ کی مٹھی بنا کر کھنکرتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کر رہے تھے، مگر جانے کیوں... انہیں الفاظ کے چناؤ میں بہت دقت پیش آرہی تھی۔

”ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا میں اتنا نروس کیوں ہوں؟“ انہوں نے خود سے سوال کیا۔ اور وہ جو حیرت کے اچانک اور شدید جھٹکے سے سنبھل چکی تھی۔ اب مجسم سوال بن کر ان کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

”وہ میں... اہم! ابھی ابھی ٹی وی آن کیا تو... پتا چلا کہ آج ہماری کونین کو میڈل ملا ہے؟“ سیٹھ کریم کو خود اپنے شکایتی لہجے کی وجہ سمجھ نہیں آرہی تھی۔

”تو...؟“

بیٹی کے یک لفظی سوال نے انہیں اور بھی بوکھلا دیا تھا۔ اس کے لہجے میں موجود حیرت ابھی تک ویسی کی ویسی تھی۔

”تو یہ کہ آپ کو بتانا چاہیے تھا نا کہ آج آپ نے اتنی بڑی اچیومنٹ کی ہے تاکہ آپ کے پاپا آپ کے ساتھ مل کر اس خوشی کو آج ہی سیلیبریٹ کرتے۔ چلو کوئی بات نہیں کل میں اپنے دوستوں کو انویٹیشن بھیج دوں گا اور آپ بھی اپنے فرینڈز کو وہ فیملی انوائٹ کر لینا پرسوں شام کی پارٹی کے لیے... ٹھیک ہے؟“

نارمل اور ہلکا پھلکا انداز اپنا کر وہ خود کو نارمل کر رہے تھے، ورنہ بیٹی کے تاثرات دیکھ کر وہ اندر سے بری طرح متزلزل تھے۔ ”اس کی کوئی ضرورت نہیں پاپا۔“ رانی نے سپاٹ لہجے میں کہا اور تیزی سے واپس کمرے میں گھس گئی۔ بند دروازہ ان کا منہ چڑھا رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار انہیں بیٹی کی کسی حرکت پر غصہ آیا تھا کیوں کہ پہلی بار انہوں نے اس کے بارے میں کچھ سوچنے کی زحمت کی تھی۔

وہ دن باپ اور بیٹی کے درمیان سرد جنگ کا پہلا دن تھا۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ اس سرد جنگ کا آغاز رانی برسوں پہلے ہی سے شروع کر چکی تھی۔ انہوں نے پہلے کبھی نوٹ ہی نہیں کیا تھا کہ جب ان کی سالگرہ پر سب انہیں مبارکباد دے رہے ہوتے تھے، تب رانی تیسری منزل کی چھت پر کھڑی مین روڈ پر چلتی ہوئی رواں دواں ٹریفک دیکھنے میں مصروف ہوتی تھی اور جب وہ بیمار پڑ کر کمرے میں بند ہو جاتے تھے تب ان کے ڈاکٹر ز، ان کے دوست اور گھر کے ملازم ان کے پاس آتے تھے، مگر رانی کبھی نہیں

آتی تھی۔ رانی نے برسوں سے خود کو ان کی ہر خوشی غمی سے الگ کر لیا تھا۔ بس وہ ہی محسوس نہ کر سکے یا انہوں نے ایسا کرنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی تھی۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ اب اپنی ماں کا چھ ماہ بعد آنے والا فون بھی کاٹ دیا کرتی تھی۔

”رانی کہاں رہ گئی کریم صاحب؟ مسز درانی کی آواز انہیں خیالوں کی دنیا سے واپس کھینچ لائی۔“

”آں... ہاں وہ اپنے کمرے میں تیار ہو رہی ہوگی، میں لے کر آتا ہوں اسے۔“ مگر وہ جانتے تھے کہ رانی کمرے میں نہیں تھی۔

وہ سست قدموں سے چلتے ہوئے چھت پر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

رانی چھت پر اپنے مخصوص کونے میں دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑی محویت سے آتی جاتی ٹریفک کو دیکھ رہی تھی۔ گھر میں جب بھی کوئی فنکشن ہوتا، رانی یہاں آکر کھڑی ہو جاتی اور تب تک نہ لوٹتی تھی جب تک گھر میں ایک بھی مہمان باقی ہوتا۔ اس کی آدم بے زاری روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی۔ سیٹھ کریم نے ہر طریقہ اپنا لیا تھا مگر وہ اپنی روش تبدیل کرنے پر راضی ہوتی نظر نہیں آرہی تھی۔ انہوں نے آج رات بارہ بجے اس کی سالگرہ منانے کا فیصلہ بھی اسی لیے کیا تھا تا کہ اس پارٹی کو اسپیشل بنا کر اسے لوگوں سے گھلنے ملنے کے لیے مجبور کیا جائے۔

”آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئیں... کیوں؟ سیٹھ کریم نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”میں نے منع کیا تھا آپ کو پاپا۔“ اس کا یہ دو ٹوک اور روکھا لہجہ ہمیشہ ان کے ضبط کے بندھن توڑ دیتا تھا۔

”آپ کو کچھ احساس بھی ہے نیچے لان مہمانوں سے بھرا ہوا ہے، سب آپ کا پوچھ رہے ہیں، بتاؤ میں انہیں جا کر کیا کہوں اب...؟ ان کا ضبط جواب دے چکا تھا۔

”کیوں کر رہی ہو ایسا؟ آج آپ کی سالگرہ ہے۔ میں نے اپنے تمام دوستوں اور خاندان والوں کو مدعو کر رکھا ہے۔ پچھلے ایک ہفتے سے گھر کی تزئین و آرائش کی جا رہی ہے کہ آج بارہ بجے آپ کیک کاٹو تو پورے شہر کو پتا چلے کہ آج میری کوئین کی سالگرہ ہے اور آپ یہاں کھڑے ہو کر آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھ رہی ہو۔ آپ کے نزدیک ہم دونوں کی خوشی کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟ اس بے ہنگم ٹریفک کو دیکھنا آپ کے لیے بہت ضروری ہے‘ آخر چاہتی کیا ہو رانی؟“ بات ختم ہونے تک ان کی آواز اچھی خاصی اونچی ہو گئی تھی۔ مگر اس اونچی آواز اور پھرے ہوئے لہجے کا رانی پر رتی برابر بھی اثر نہ ہوا۔

”میں نے کہا نا پاپا... میں نے منع کیا تھا آپ کو مجھے کوئی انٹر سٹ نہیں ہے اپنی سالگرہ سیلیبریٹ کرنے اور آپ کے اسپیشل گیسٹس سے ملنے... آپ نے خود ہی سب کچھ کیا ہے، اب کیک بھی خود ہی کاٹے۔“ اس نے ٹریفک سے نظریں ہٹائے بغیر بے نیازی سے کہا۔

سیٹھ کریم بے بسی سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے ان کے لاکھ کہنے کے باوجود بھی وہ نہیں آئے گی۔

سیڑھیاں اترنے سے پہلے انہوں نے ایک بار مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ ہنوز ٹریفک دیکھنے میں مگن تھی۔

☆...☆...☆

گیارہ جون بروز بدھ (2013ء)

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس دن میں اپنے باپ کو آخری بار صحن میں لیٹے آسمان کو گھورتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ وہ اُن کی زندگی کی آخری شام تھی۔ اگلے دن صبح وہ مجھے اکڑی ہوئی لاش کی صورت میں نظر آئے۔ شاید رات کے کسی پہر اُن کی روح نے اُن کے جسم سے ناتا توڑ لیا تھا۔ میرا باپ مر چکا تھا۔

میں نے دکھی دل کے ساتھ اُنہیں اپنے ہاتھوں سے قبر میں لٹایا۔ میری فیملی کا ایک فرد کم ہو گیا تھا۔ اب مٹی کے اس کچے گھر میں صرف میں اور میری ماں رہتے تھے۔ میرے سامنے

اب بھی ایک سوال موجود تھا جسے حل کیے بغیر میں اس گاؤں کو چھوڑ کر شہر نہیں جاسکتا تھا اور وہ سوال تھا میری ماں...

میری وہ ماں جس کے ہاتھ میرے بچپن کو سنوارنے کے لیے دوسروں کے گھروں میں جھاڑو لگا لگا کر سخت ہو چکے تھے۔ میں اسے گھر میں تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتا تھا اور ساتھ لے کر بھی نہیں جاسکتا تھا مگر ماں کو میرے پاؤں کی زنجیر بننا منظور نہیں تھا۔ ابا کی موت کے پانچ ماہ بعد ہی اس نے مجھے شہر جانے کے لیے راضی کر لیا۔

”دیکھ پرویز! تجھے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانے کا خواب صرف میرا نہیں، بلکہ تیرے ابا کا بھی تھا مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تیرے باپ کی بیماری نے تیرا راستہ روک لیا تھا۔ اب وہ خدا کی مرضی سے نہیں رہا اور میرے اندر اتنی ہمت ہے کہ میں تیری کامیابی کے لیے اس گھر میں اکیلی رہ لوں، تو شہر چلا جائیگا۔ تیرے پاس تھوڑی بہت تعلیم بھی ہے، کمپیوٹر بھی سیکھتا رہا ہے۔ اللہ کرے گا تجھے نوکری مل جائے گی اور اس ادھی ادھوری دھاڑی سے جان بھی چھوٹ جائے گی۔ جب تو وہاں سیٹ ہو جائے گا تو میں بھی تیرے پاس آ جاؤں گی۔ یہاں رہ کر خود کو ضائع مت کر۔“ میری ماں کی ساری باتیں بجا تھیں، مگر انہیں اس طرح تنہا چھوڑ کر جانا میرے لیے آسان نہیں تھا۔

”مگر ماں! میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہوں اور پھر میں شہر میں رہوں گا کس کے پاس؟ میں تو وہاں کسی کو جانتا بھی نہیں... نوکری کیسے ڈھونڈوں گا میں؟“ میں ان سب سوالوں کے جواب ڈھونڈ سکتا تھا مگر ماں کے سامنے رکھ کہ میں یہ چاہتا تھا کہ شاید میری ماں بھی انہی سوالوں کے بہانے مجھے اپنے پاس روک لے... مگر میرا خیال غلط تھا۔

”میں نے خالد صاحب سے تمہاری بات کی ہوئی ہے۔ انہوں نے ایک نمبر دیا ہے مجھے۔ تم وہاں جا کر اسے ٹیلی فون کر لینا۔ وہ تمہارا سب بندوبست کر دے گا۔ خالد صاحب نے کہا ہے وہ تمہیں نوکری بھی دلوادے گا۔ وہاں اس کی کافی جان پہچان ہے؟“ ماں نے یہ کہتے ہی اپنی چادر کے پلو سے باندھا ہوا ایک چھوٹا سا مٹر اتر کاغذ کا ٹکڑا امیرے حوالے کر دیا۔ میں نے کاغذ لیتے ہوئے بے یقینی سے ماں کی طرف دیکھا۔ اس کا مطلب اس نے پہلے ہی سے مجھے بھیجنے کا سوچ رکھا تھا۔

”یہ خالد صاحب کا کوئی رشتہ دار ہے؟“ میں نے کاغذ پر لکھا ہوا نمبر دیکھ کر ماں سے پوچھا تھا۔

”نہیں... ان کا ڈرائیور تھا پہلے۔ پھر کسی وجہ سے چھوڑ کر شہر چلا گیا۔ اب بھی جو ڈرائیور رکھا ہوا ہے خالد صاحب نے وہ اسی کا کوئی رشتہ دار ہے۔ تم فکر نہ کرو خالد صاحب نے مجھے پوری تسلی کروائی ہے کہ وہ اچھا آدمی ہے۔ وہاں تمہارا خیال رکھے گا۔“

”مگر میں آپ کو اس طرح اکیلے کیسے چھوڑ دوں؟“ میں نے پریشان ہو کر کہا۔ میں جانتا تھا ماں اب مجھے بھیج کر ہی دم لے گی۔

”تم میری فکر نہ کرو... میں پہلے بھی تو اکیلی ہی رہتی تھی۔ جب تم پڑھتے تھے اور تمہارے ابا کام پر جاتے تھے اور میں ویسے بھی اکیلی کہاں رہنے والی ہوں، چلی جایا کروں گی کبھی خالد صاحب کے ہاں اور کبھی اڑوس پڑوس میں۔ تم میری فکر مت کرو پرویز... تم شہر جاؤ بیٹا اور کچھ کر کے دکھاؤ اپنی ماں کو۔“ ماں نے میرا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔ اندر سے اس کی کیا کیفیت ہوگی، اس کا مجھے اچھی طرح اندازہ تھا۔

اگلے دن صبح پہلی گاڑی سے میں کراچی کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ ماں نے مجھے رخصت کرتے وقت ڈھیر ساری نصیحتیں اور دعائیں بھی میرے ساتھ ہی رخصت کی تھیں۔ میں نے گھر سے نکلتے وقت خود سے وعدہ کیا تھا کہ میں اپنی ماں کی باقی زندگی ان تمام خوشیوں سے بھر دوں گا جن کے لیے وہ زندگی بھر ترستی رہی تھیں۔ میں ان کے بڑھاپے کو ان کی زندگی کا سب سے خوبصورت دور بنانے کا عزم لے کر گھر سے نکلا تھا۔

مرتضیٰ نامی اس آدمی کے ساتھ میری بات ہو چکی تھی۔ اس نے مجھے سہراب گوٹھ اترنے کا کہا تھا۔

گاڑی چوبیس گھنٹے کے طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد میری منزل پر پہنچی تھی۔ جو نہی کنڈکٹر کی آواز میرے کانوں میں پڑی ”سہراب گوٹھ والے آجائیں“ تو میں نے شکر کا کلمہ پڑھا اور اپنا بیگ جس میں چند کپڑوں کے جوڑوں کے علاوہ ایک عدد جو تلوں کا جوڑا تھا، لے کر بس سے اتر آیا۔

میرے سامنے بسوں، رکشوں، موٹر سائیکلوں، کاروں اور چلتے پھرتے انسانوں کا جم غفیر تھا۔ پائیدان سے نیچے پاؤں رکھتے ہی درجن بھر ٹیکسی اور رکشا ڈرائیور بھاگتے ہوئے میرے پاس آئے اور میرے ہاتھ سے بیگ چھیننے کی کوشش کرنے لگے۔ ان میں سے ہر ایک مجھے اپنی طرف گھسیٹ رہا تھا۔

”مجھے کہیں نہیں جانا بھائی۔“

میں نے چیختے ہوئے چار قدم پیچھے ہٹ کر کہا اور بڑی مشکل سے اپنا بیگ ان کے چنگل سے آزاد کرایا۔

زندگی میں پہلی بار مجھے اس طرح کی صورت حال کا سامنا ہوا تھا۔

میں نے اس سے پہلے گاؤں کے نزدیک ایک قصبہ نما چھوٹا سا شہر دیکھا ہوا تھا جہاں میں کالج میں پڑھتا تھا۔ اس لیے کراچی جیسے بڑے شہر میں آتے ہوئے گھبراہٹ کا ہونا ایک فطری عمل تھا۔

وہاں آدھا گھنٹا دھوپ میں سوکھنے کے بعد مجھے مرتضیٰ کی شکل نظر آئی۔

مرتضیٰ ادھیڑ عمر اور سر سے گنجا تھا۔ پہلی نظر میں اسے دیکھ کر کچھ اچھا سوچنا کافی مشکل بات تھی، مگر جس صورت حال میں وہ مجھے نظر آیا میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا تھا۔

اس کے پاس ایک گھسی پٹی موٹر سائیکل تھی جس پر اس کے پیچھے دس بارہ سال کا لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے موٹر سائیکل سے اترے بغیر ہی ہاتھ کے اشارے سے مجھے بھی پیچھے بیٹھنے کو کہا، میں نے بیگ کاندھے پر لٹکایا اور لڑکے کے پیچھے بیٹھ گیا۔ موٹر سائیکل ایک جھٹکے سے چل پڑی۔ میرے لیے پہلا جھٹکا خاصا زوردار ثابت ہوا تھا۔ یوں سمجھ لیں میں نے گرنے سے بچنے کے لیے بچے کا کالر پکڑا۔

”آرام سے بھاجی“ بچے نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

آدھے گھنٹے کے انتہائی تکلیف دہ سفر کے بعد ہم ایک چھپر ہوٹل کے سامنے کھڑے تھے۔ موٹر سائیکل سے اتر کر میں نے حیرت سے مرتضیٰ نامی گنجے شخص کی طرف دیکھا۔ اس نے پورے راستے سوائے بے ہودگی سے موٹر سائیکل چلانے کے کوئی بات نہیں کی تھی۔

”اپنا ہی ہے باؤ... آؤ بیٹھ جاؤ ادھر۔“ اس نے چھپر کے اندر رکھے ہوئے اکلوتے مگر لمبے چوڑے پھٹے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں نے دل شکستگی کے ساتھ بیٹھتے ہوئے اپنا بیگ پھٹے کی ایک سائیز پر رکھا اور خود بھی کونے پر ٹک سا گیا۔

”جوتا اتار کے اوپر بیٹھ جاؤ باؤ... بلکہ کچھ دیر آرام کر لو۔ میں تمہارے لیے چائے بنواتا ہوں۔ اوئے چھوٹے! چل چائے بنا کر لا اس کے لیے۔“ میں نے بے دلی سے جوتے اتار کر پاؤں اوپر کر لیے اور ایک سرسری سی نظر سے اس چھوٹے سے چھپر ہوٹل کا جائزہ لیا۔

ہوٹل کیا تھا، بس ایک گھر کے عام کچن سے کچھ بڑا ہو گا۔ دو چولہے، کچھ برتن، چار ٹوٹی ہوئی کرسیاں اور دو ٹوٹے ہوئے ٹیبل اور ایک یہ چوکور پھٹا۔ بس یہ ہوٹل تھا، چاروں طرف سے آزاد... یہاں بیٹھ کر صرف دھوپ سے بچا جاسکتا تھا۔ اس ہوٹل کی سب سے خاص بات لوکیشن تھی۔ میں نے چاروں طرف نظریں گھا کر دیکھا۔ پینل کے گھنے درخت کے نیچے بنے ہوئے اس چھپر کے پچھواڑے ٹریفک رواں دواں تھی اور سامنے رہائشی علاقہ تھا جہاں تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ قطار میں بنی ہوئی کوٹھیاں تیتی دھوپ میں چمکتی نظر آرہی تھیں۔ یقیناً اس ایریا میں رہنے والے لوگ اچھے خاصے کھاتے پیتے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے قطار کے بیچوں بیچ بنی ہوئی وسیع و عریض اور شان دار تین منزلہ کوٹھی کو دیکھا۔

”کتنی خوبصورت اور پرسکون زندگی ہوگی اس عالی شان محل میں رہنے والوں کی۔“ میں نے کوٹھی کی شان و شوکت دیکھ کر دل ہی دل میں سوچا۔
قطار میں بنی کوٹھیوں اور مین روڈ پر چلتے ہوئے ٹریفک کے درمیان ایک چھوٹا سا پارک بنا ہوا تھا جو اس وقت سنسان پڑا تھا۔
”چائے!“

چھوٹا چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے میرے سامنے کھڑا تھا۔
میں نے پارک سے نظریں ہٹا کر پہلے چھوٹے کو، پھر پچھلے پر قمیص اتار کے لیٹے ہوئے مرتضیٰ کو دیکھا۔

”چاچا آپ کا گھر کہاں ہے؟“ میں نے چائے کا کپ ہاتھ میں لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔
مرتضیٰ نے سر اٹھا کر ترچھی نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر سے نیچے پھٹے پر ٹکا دیا اور دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔ مجھے اس کی سرد مہری کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔

”ہمارا یہی ٹھکانہ ہے بھابی... دن میں کام، رات کو آرام۔“ چھوٹے نے مسکرا کر مجھے بتایا۔

”یہاں...؟“ میں نے حیرت سے منہ کھول کر چھوٹے سے پوچھا۔

”ہاں! یہاں.....“ مرتضیٰ نے جھٹکے سے اٹھ کر مجھے دیکھا۔

”اس سے پہلے کبھی نکلے ہو گھر سے؟ کبھی دیکھا ہے پہلے کوئی بڑا شہر؟ یہاں اس جگہ پر اپنا ہوٹل چلانا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ بڑے شہروں میں سو طرح کے مسائل ہوتے ہیں۔ ہم تو پھر بھی خوش نصیب ہیں جو اپنا ہوٹل چلاتے ہیں اور یہیں پر سونے کی جگہ بھی مل جاتی ہے ورنہ اس شہر میں ہزاروں لوگوں کے پاس سرچھپانے تک کو آسرا نہیں ہے... مجھے ایک بات تو بتا، یہاں رہنے میں تجھے تکلیف کس بات کی ہے؟ اور تو کون سا محل سے اٹھ کے آیا ہے جو اتنے دیدے پھاڑ رہا ہے اس جگہ کو دیکھ کے؟ وہ تو خالد صاحب نے تیری ماں کے ترلوں سے تنگ آ کے فون کر دیا۔ ورنہ مجھے تو تیری ضرورت ہی نہیں تھی۔“ مرتضیٰ نام کے اس چاچا کے اندر مروت رتی بھر بھی نہیں تھی۔ مجھے میری اوقات یاد دلانے میں ذرا دیر نہ کی تھی اُس نے۔ میں نے کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا گھر سے نکلتے وقت۔ میرا خیال تھا وہ مجھے اپنے گھر لے جائے گا جہاں میں نہادھو کے کھانا کھا کے پہلے اپنی نیند پوری کروں گا پھر نوکری ڈھونڈنا شروع کروں گا اور جب تک مجھے اچھی نوکری نہیں ملے گی، میں اس کے گھر رہوں گا اور جب کچھ کمانے لگ جاؤں گا، تو اس کا سارا حساب برابر کر کے اپنے لیے الگ رہائش کا بندوبست کروں گا اور پھر ماں کو بھی یہیں بلواؤں گا۔ میں نے نوکری کے ساتھ ساتھ پڑھائی کا بھی سوچ رکھا تھا مگر خالد صاحب کے اس پرانے ڈرائیور نے دو منٹ میں میرے سارے خواب چکنا چور کر دیے تھے۔ میرے ارادے اس کی باتیں سن کر دھوئیں

کی طرح اڑ چکے تھے۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی آسرا بھی نہیں تھا۔ میں اس کے رحم و کرم پر زیادہ دن تک رہنے والا نہیں تھا، مگر اس وقت اس کے پاس رہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

اس کے تیور دیکھ کر دل میں آئے سوالات کا گلہ گھونٹ کر میں نے جوتے پہنے اور ایک سائیڈ پر لگے ہوئے نل کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ منہ پر لگ بھگ دس بارہ چھینٹے مارنے کے بعد مجھے کچھ بہتر محسوس ہوا مگر بھوک اور نیند کا غلبہ ابھی تک اپنی جگہ قائم تھا۔ میں نے چھوٹو کی طرف دیکھا اور خالی ہاتھ کا نوالہ بنا کر منہ کی طرف کرتے ہوئے اشارہ کیا۔ وہ حسب معمول مسکرایا اور ہاتھ کے اشارے سے ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

میں ٹیبل کے پاس جا کر ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تبھی دو آدمی آپس میں باتیں کرتے ہوئے سیدھے آکر میرے ساتھ والی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان دونوں کے ہاتھ میں سلگتے ہوئے سگریٹ تھے۔ ان میں سے ایک نے چھوٹو کی طرف دیکھ کر آواز لگائی۔

”اے چھوٹو! دوچائے ملائی مار کے۔“ ان کے اس طرح چھوٹو کو بلانے سے پتا چلتا تھا وہ یہاں روزانہ آتے تھے۔ چھوٹو نے میرے لیے کھانا گرم کرنے کے ساتھ ساتھ کیتلی میں چائے کا پانی چڑھا دیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد میرے اندر نیند کی طلب اور بھی زور پکڑ چکی تھی۔ میں

نے پھٹے پر ٹانگیں اور بازو پھیلائے مرتضیٰ کو دیکھا۔ اس کے خراٹوں سے لگتا تھا کہ اس کا ابھی دو چار گھنٹوں تک اُٹھنے کا کوئی موڈ نہیں ہے۔

”آتے ہی مر گیا... جانے کب سے نہیں سویا گنجا۔“ میں نے نیند سے بوجھل آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے غصے سے سوچا تھا۔

”آپ بھی سو جاؤ بھاجی اس طرف۔“ چھوٹو نے دانت نکوستے پھٹے کی دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے مشورہ دیا۔

”مگر چاچا ڈسٹرب ہو جائے گا۔“ میں نے مرتضیٰ کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ اس کی بنیان سے اس کی بڑھی ہوئی توند بھی واضح نظر آرہی تھی۔

”کیا ہو جائے گا بھاجی؟“ چھوٹو کو سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

”میں نے کہا چاچا جاگ جائے گا۔“ میں نے وضاحت کر دی۔

”اوجی نہیں جاگے گا... ہم روزرات کو اکٹھے ایک ہی پھٹے پر سوتے ہیں اور کبھی کبھی مہمان آجائے تو وہ بھی ساتھ ہی سو جاتا ہے۔ اتنا بڑا پھٹا اسی لیے تو لگایا ہے بھاجی۔ آپ سو جاؤ یہ نہیں جاگے گا۔“ چھوٹو نے میری بات کو رد کر کے پھر سے کہا تھا۔

”اور اگر گاہک آگئے تو؟“ میں نے اس کی ننھی سی جان کو دیکھ کر کہا۔

”کیا آگئے جی؟“ اس نے ایک بار پھر نا سمجھی کے انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں بے اختیار مسکرا دیا۔

چھوٹو بھولی بھالی شکل کا چھوٹا سا بچہ تھا۔ یہ اس کی اسکول میں پڑھنے کی عمر تھی مگر قسمت نے اسے اس چھپر ہوٹل میں لا کھڑا کیا تھا۔ قسمت نے کیا تو میرے ساتھ بھی ایسا ہی تھا مگر میں چھوٹو کی عمر میں شہزادوں کی طرح رہا کرتا تھا۔

”میں نے کہا اگر چائے پینے والے یا کھانا کھانے والے آگئے تب تم کیا کرو گے؟

”اس ٹائم کوئی نہیں آتا جی۔ کوئی ایک دو گاہک آجائیں تو آجائیں... انہیں میں سنبھال لوں گا۔ زیادہ ہجوم تو شام کو ہوتا ہے یا پھر سویرے ناشتے کے ٹائم پر۔“ میں نے اس کی بات سن کر سر ہلایا اور پھٹے کی دوسری طرف چڑھ کے لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں خوابوں کی دنیا میں پہنچ چکا تھا۔

میری آنکھ مرتضیٰ کی آواز سے کھلی۔

”چل اٹھ جا کا کا... کام کا وقت ہے ابھی۔“ میں نے پھٹے پر کسماتے ہوئے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ چاچا مرتضیٰ کا چھپر ہوٹل چالو ہو چکا تھا۔ مجھے اب کرسیوں کے ساتھ ساتھ لوہے کے بنے ہوئے تین چار بیچ بھی نظر آرہے تھے جہاں لوگ بیٹھ کر چائے پینے اور گپیں ہانکنے میں مشغول تھے۔

”مجھے نہا کر کپڑے بدلنے ہیں۔“ میں نے ہاتھ منہ دھو کر چاچا مرتضیٰ سے کہا۔

”یہاں سے حمام قریب ہی ہے پر تو کل سویرے چلے جایو... کپڑے بھی کل ہی بدل لیو۔“ میں نے اس کی بات سن کر بہ غور اس کی اور چھوٹو کی حالت دیکھی۔ میرا اندازہ تھا یہ لوگ ہفتے میں ایک بار ہی حمام جاتے ہوں گے۔ یہاں منہ ہاتھ دھو کے ہی کام چلایا جاتا ہو گا۔

چاچا مرتضیٰ نے میرے ذمے برتن دھونے اور چائے بنانے کا کام لگایا تھا۔ اس کے خیال میں یہ دونوں کام آسان تھے جو میں کر سکتا تھا۔ شام کی روٹی اور صبح کا ناشتا اس نے اپنے ذمے لے رکھا تھا اور چھوٹو باہر سے سودا سلف اور دودھ لانے کے علاوہ ہم دونوں کی مدد کرنے پر معمور کر دیا گیا تھا۔

میں نے اس سے پہلے کبھی چائے نہیں بنائی تھی اور نہ ہی برتن دھونے کا تجربہ تھا مگر فی الحال یہ سب کرنا میری مجبوری تھی۔ جب تک میں یہاں اپنی جان پہچان نہیں بناتا، اس چھپر ہوٹل کا بیرابن کے رہنا ہی مجھے مناسب لگ رہا تھا۔

”مہینا بھر کام کر لو پھر دیکھوں گا تمہیں کتنی تنخواہ دینی ہے، پر بے فکر رہو۔ گاؤں میں دھاڑی کر کے جتنا کماتے تھے، اس سے کچھ نہ کچھ زیادہ ہی مل جائے گا تمہیں۔“ چاچا مرتضیٰ نے شام میں جب گاہک کچھ کم تھے، مجھے کہا میں صرف اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔ میں یہاں اس

کی نوکری کرنے نہیں بلکہ نوکری ڈھونڈنے آیا تھا مگر یہ بات بتا کر اس سے رحم کی توقع کرنا بے وقوفی تھی۔

میں نے دونوں بازوؤں کے کف چڑھائے اور بڑے شہر کی پہلی نوکری شروع کر دی۔ ہر وقت مسکرا کر بات کرنے والا چھوٹو جانے کیوں اس وقت مجھے برتن اٹھائے دیکھ کر افسردہ سا ہو گیا۔

☆...☆...☆

گیارہ جون بروز بدھ (2013ء)

”بیٹا آپ آخری بار کب ہنسی ہو؟“ بہ غور ڈاکٹر جیلانی نے رانی کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا لیکن وہ اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے اس کے شاندار آفس کا جائزہ لے رہی تھی۔

”آفس بہت اچھا ہے آپ کا... ویل ڈیکوریٹڈ!“ اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح بے تاثر تھا۔

”اوہ! تھینک یو... مگر میں نے ابھی ابھی آپ سے ایک سوال کیا ہے۔ آپ آخری بار کب ہنسی تھیں؟“ ڈاکٹر جیلانی نے اپنا سوال نظر انداز کیے جانے پر برا منائے بغیر پھر سے دہرایا۔

”آپ پاپا کو کب سے جانتے ہیں؟“ اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کیا تھا۔

”تقریباً قریب دس سال سے... کیوں؟“ ڈاکٹر نے تعجب سے پوچھا۔

”پاپا مجھے دس سال پہلے یہاں لے کر آتے تو شاید کچھ فائدہ ہو ہی جاتا۔“ اس نے شیشے کے پار ویٹنگ روم میں بیٹھے اخبار پڑھتے سیٹھ کریم کو دیکھ کر کہا۔

”اوہ ہا ہا...“ ڈاکٹر نے ایک چھوٹا سا تہقہہ لگایا۔

”چلو کوئی بات نہیں... مثل مشہور ہے دیر آید درست آید۔“ ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے ہوئے ڈاکٹر جیلانی نے تیسری بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

”ہاں تو میں پوچھ رہا تھا کہ آپ آخری بار کب ہنسی تھیں؟“

”یاد نہیں۔“ اس کا لہجہ حد درجہ سپاٹ اور مشینی تھا۔

”اوکے!“ ڈاکٹر نے گہرائی سے اس کے سپاٹ لہجے اور بے تاثر آنکھوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے پرسوج انداز میں سر ہلا کر کہا:

”میں آپ سے کچھ سوال کروں گا اور آپ نے ان کا جواب صرف یس یا نو میں دینا ہے۔“
ڈاکٹر نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے تھوڑا سا آگے
کی طرف جھک کر کہا۔

”آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں ڈاکٹر۔“ اس کا لہجہ اب بھی کسی قسم کے تاثر سے عاری
تھا۔

”وہ تو میری عادت ہے۔ آپ نے بس وہ کرنا ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔“ ڈاکٹر نے پھر
مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ ٹیبل پر پڑے ہوئے گلاس کو گھورنے لگی۔

”ہاں تو شروع کرتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور سوالات کا سلسلہ شروع
کر دیا۔

”آپ کا نام رانیہ کریم عرف رانی ہے؟“

”یس۔“

”آپ فالکن یونیورسٹی سے ریلیشن شپ میں ماسٹر ز کر رہی ہیں؟“

”یس۔“

”آپ نے میٹرک میں پورے کراچی سے ٹاپ کیا اور وزیر تعلیم نے آپ کو میڈل دیا تھا۔“

”یس۔“

”آپ دوست بناتی ہیں؟“

”نو“

”آپ بنانا چاہتی ہیں؟“

”نو“

”آپ تنہائی پسند ہیں؟“ ڈاکٹر جیلانی نے سوالات کا زاویہ گھماتے ہوئے اگلا سوال کیا:

”یس“

”آپ کو غصہ زیادہ آتا ہے؟“

”نو“

”کم آتا ہے؟“

”نو“

”اس کا مطلب آپ کو غصہ نہیں آتا؟“

”نو“

”آپ کو ترس آتا ہے۔؟“

”یس۔“

”غریبوں، کم زوروں لاچاروں اور معذوروں پر جن کے ساتھ زندگی اچھا سلوک نہیں کرتی؟“

”نو!“

”واٹ! تو پھر آپ کو کس پر ترس آتا ہے؟“ ڈاکٹر جیلانی نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ نے صرف یس اور نو کہنے کا بولا تھا ڈاکٹر۔“ اس نے گلاس سے نظریں ہٹا کر ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے سرد میری سے کہا۔

”اوکے اوکے! ہم وہیں سے شروع کرتے ہیں۔“ اس بار ڈاکٹر جیلانی تھوڑی خجالت سے بولے۔

”آپ اپنی سالگرہ نہیں مناتیں؟“

”نو۔“

”گھر آئے مہمانوں سے بات نہیں کرتیں؟“

”نو۔“

”پاپا کے کہنے پر بھی نہیں؟“

”یس۔“

”آپ اپنے پاپا سے پیار کرتیں ہیں؟“

”یس۔“

”اور ماما سے بھی۔“

”یس۔“

”آپ پچھلے دو سال سے ماما کے ساتھ فون پر بات نہیں کرتیں؟“

”یس۔“

”آپ پاپا کی بات نہیں مانتیں مگر ان سے پیار کرتی ہیں؟“

”یس۔“

آپ ماما کا فون کاٹ دیتی ہیں، مگر ان سے پیار کرتی ہیں؟“

”یس۔“

”آپ کے پاپا اور ماما آپ سے پیار کرتے ہیں؟“

”آپ اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہے ہیں ڈاکٹر۔“ اس نے اپنے لہجے اور آواز کو بے تاثر

رکھنے کی پوری کوشش کی تھی مگر ڈاکٹر جیلانی کی گھاگ نظریں اس کے چہرے کے تاثرات

ٹٹول رہی تھیں۔ اس نے مشینی انداز میں بات کرنے والی لڑکی کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش پا

لیا تھا۔

”آپ شاید بھول گئی ہیں... آپ کو صرف یس یا نو کہنا ہے۔“ ڈاکٹر جیلانی قدرے اطمینان سے اسے یاد کرایا اور کچھ دیر توقف کے بعد اپنا سوال پھر سے دہرایا:

”کیا آپ کے پاپا اور ماما آپ سے پیار کرتے ہیں؟“

”یہ سوال آپ کو پاپا اور ماما سے کرنا چاہیے... مجھ سے نہیں۔“ اس بار اس نے اپنا مخصوص انداز آسانی سے اپنالیا تھا۔

ڈاکٹر چند لمحے خاموشی سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔

”اوکے... میں آپ سے آخری سوال کرنے لگا ہوں اور آپ کو اس کا صحیح جواب دینا ہے۔“ ڈاکٹر نے ہلکا سا توقف کیا اور پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:

”آپ کو کن لوگوں پر ترس آتا ہے۔“

رانی نے گہری سانس لی اور ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تنہا لہجے میں صرف دو الفاظ کہے۔

”یتیموں پر...“

”اٹس اوکے بیٹا! آپ باہر ویٹنگ روم میں بیٹھیے اور کریم صاحب کو اندر بھیج دیجیے۔“ ڈاکٹر جیلانی کی بات ختم ہوتے ہی راینہ وہاں سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔

کچھ دیر بعد سیٹھ کریم ڈاکٹر کے سامنے بیٹھ کر سوالیہ نظروں سے انہیں گھور رہے تھے۔

”کریم صاحب! میرے خیال میں آپ کی بیٹی آپ سے اور آپ کی مسز سے نالاں ہے۔ اس کے خیال میں آپ اور آپ کی مسز اس سے پیار نہیں کرتے۔ میں نے یہ چیز اکثر بچوں میں دیکھی ہے جو ماں باپ کی عدم توجہی کا شکار رہتے ہیں اور بڑے ہو کر کمپلیکس کا شکار ہو جاتے ہیں اور...“

”اوہ سٹاپ ڈاکٹر جیلانی...“ رانی سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر جیلانی کو سیٹھ کریم کی قدرے غصیلی آواز نے روک دیا۔

”آپ کو لگتا ہے کہ میری بیٹی... میری... یعنی کہ سیٹھ کریم کی بیٹی کسی قسم کے کمپلیکس کا شکار ہے؟“ doctor are you mad? ”اسے کس چیز کی کمی ہے؟ وہ سوچتی بعد میں ہے اور وہ چیز اسے مل پہلے جاتی ہے۔ سب اسے ایسے ہی رانی نہیں کہتے۔ وہ رانیوں سے بڑھ کر زندگی گزار رہی ہے ڈاکٹر۔“ سیٹھ کریم شاید ڈاکٹر جیلانی کی بات کو خود پر طنز سمجھتے تھے اسی لیے آگ بگولہ ہو رہے تھے۔

”میرا وہ مطلب نہیں ہے کریم صاحب! میں جانتا ہوں آپ شہر کے دولت مند اور بااثر افراد میں سے ایک ہیں مگر سائیکالوجسٹ ہونے کے ناتے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ کی بیٹی کے اندر کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی کمپلیکس چھپا ہوا ہے اور عین ممکن ہے یہ آپ کی اور

آپ کی مسز کی وہ عدم توجہی ہو جسے آپ کی بیٹی نے بچپن میں بے تحاشا محسوس کیا ہو۔”
ڈاکٹر نے اپنی بات کی مکمل وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھیے کریم صاحب! میرے خیال میں آپ کو اور آپ کی مسز کو اس وقت اپنی توجہ کا محور صرف اور صرف اپنی بیٹی کو رکھنا چاہیے۔ وہ عمر کے جس دور سے گزر رہی ہے اس میں اسے اس بات کا یقین اور اطمینان ہونا بہت ضروری ہے کہ اس کے ماں باپ اس سے بے پناہ پیار کرتے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کی بیٹی کا اس سے بہتر اور کوئی علاج نہیں ہے۔” ڈاکٹر نے حتی انداز میں بات کرتے ہوئے کہا۔

سیڈھ کریم نے سر گھما کر شیشے کے پار بیٹھی رانی کو دیکھا۔ وہ ٹھیک اسی جگہ بیٹھی تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ اخبار پڑھ رہے تھے۔

”شاید تم ٹھیک کہتے ہو ڈاکٹر! مگر میری بیٹی نے آج تک مجھ سے کوئی گلہ یا شکوہ نہیں کیا اور نہ ہی وہ اپنی ماں سے کرتی ہے... وہ ہماری بیٹی ہے۔ ہم بھلا کیسے اسے پیار نہیں کریں گے؟“
ڈاکٹر جیلانی نے ان کی بات سن کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

”بے شک وہ آپ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ آپ اس سے پیار بھی کرتے ہیں مگر کیا وہ یہ جانتی ہے کہ آپ اس سے بہت زیادہ پیار کرتے ہیں؟ کیا کبھی آپ نے اسے یہ احساس دلوایا ہے کہ آپ اس سے پیار کرتے ہیں؟ کریم صاحب جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں آپ کی بیٹی آپ کی

ذات سے مانوس ہے اور اپنی ماں سے بھی۔ آپ نے ابھی کہا کہ آپ کی بیٹی نے سوچا بعد میں اور وہ پورا پہلے ہو گیا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آج تک آپ کی بیٹی نے کیا کیا سوچا جو سوچنے سے پہلے پورا ہو گیا؟ کیا آپ اس کی پسند ناپسند سے واقف ہیں؟ کیا آپ اس کی پسندیدہ ڈش بتا سکتے ہیں مجھے؟ آپ کبھی نہیں بتا سکتے کریم صاحب کیوں کہ آپ بھی اپنی بیٹی سے اتنے ہی فاصلے پر کھڑے ہیں جتنی وہ آپ سے دور ہے۔ آپ نے کہا اس نے آج تک آپ سے کوئی گلہ اور شکوہ نہیں کیا۔ میں معذرت چاہوں گا کریم صاحب مگر اس نے کبھی آپ کو اس لائق ہی نہیں سمجھا۔” ڈاکٹر جیلانی نے سیڈھ کریم کی بارعب شخصیت کو نظر انداز کرتے ہوئے مستحکم آواز میں کہا۔

”اوہ شٹ اپ ڈاکٹر! جسٹ شٹ اپ۔“ سیڈھ کریم ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے تند لہجے میں دھاڑے:

”میں یہاں اپنی بیٹی کو اس لیے نہیں لایا کہ تم ہماری ذاتی زندگی میں گھسنا شروع کر دو اور اس کے اس عجیب و غریب رویے کی ساری ذمہ داری ہمارے سر تھوپ دو۔ اس شہر میں اور بھی بہت سارے ڈاکٹر موجود ہیں۔ میں اس کا علاج کروالوں گا اور وہ بہتر بھی ہو جائے گی۔ تمہیں اس کے لیے مزید زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔“ تنفر سے کہتے ہوئے وہ دروازے کی طرف مڑے تھے جب ڈاکٹر کی آواز نے انہیں روک لیا۔

”آپ کی بیٹی میری تعریف کرے گی۔ اس سے پوچھیے گا ضرور۔“ ڈاکٹر جیلانی نے دونوں ہاتھ پیٹ کی جیب میں ڈال کر ویٹنگ روم میں بیٹھی رانی کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔

”ہونہہ...“ سیڈھ کریم نے طنزیہ ہنکارا بھرا اور واپس مڑ کر دروازے سے باہر نکل گئے۔ ڈاکٹر جیلانی نے دونوں باپ بیٹی کو باہر نکلتے دیکھا اور واپس اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

رانی نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اپنے باپ کی طرف دیکھا جو ہونٹ بھینچ کر خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہے تھے۔

”انکل جیلانی اچھے ڈاکٹر ہیں۔“ تھوڑی دیر تک باپ کو دیکھنے کے بعد اس نے سامنے روڈ پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ سیڈھ کریم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”اوہ ریلی...؟ چلو کوئی تو آپ کو بھی پسند آیا۔ آپ اگر چاہو تو میں اسے روز گھر بلوا لیا کروں گا تاکہ آپ کو بھی کمپنی مل سکے اور آپ کا علاج بھی ہو سکے۔“ سیڈھ کریم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”مجھے کوئی بیماری نہیں ہے پاپا۔“ رانیہ جو کچھ دیر سے خوش گوار موڈ میں تھی، یک دم پھر سنجیدہ ہو گئی۔

”بیٹا آپ نارمل لوگوں کی طرح بات کیوں نہیں کرتیں؟ ایسے روبوٹ کی طرح بات کرنے سے آپ اور بھی ابنا رہے لگتی ہو۔“ سیڈھ کریم قدرے خفگی سے بولے۔ اس نے باپ کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا، سو خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”آپ کو پتا ہے ڈاکٹر نے مجھے کیا کہا؟“ سیڈھ کریم نے کچھ دیر خاموش رہ کر پھر سے بات کا سلسلہ شروع کیا۔ مگر وہ ہنوز باہر دیکھنے میں مگن تھی۔

”کہتا ہے میں اور آپ کی ماما آپ سے پیار نہیں کرتے اس لیے آپ ایسی ہو گئی ہو اور یہ بھی کہ میں نہیں جانتا کہ میری بیٹی کی پسند ناپسند کیا ہے؟ اب اس مڈل کلاس ذہنیت کے ڈاکٹر کو میں کیسے سمجھاتا کہ ہمارے یہاں پیار جتانے کے لیے بچوں کی پرسنل لائف میں کبھی دخل نہیں دیا جاتا۔ پھر ہم چھوٹے لوگوں کی طرح آٹھ گھنٹے کام کر کے باقی کے سولہ گھنٹے گھر بیٹھ کر بیوی بچوں کی پسند ناپسند پوچھ کر ضائع تو نہیں کر سکتے۔ ہماری کلاس کے اپنے اسٹینڈرڈز ہوتے ہیں مگر یہ اس جیلانی کے بھیجے میں گھسنے والی بات نہیں تھی۔ اس لیے میں اسے اس کی اوقات دکھائے بغیر ہی باہر نکل آیا۔ غلطی بھی میری اپنی تھی۔ میں ہمدانی کی باتوں میں آ گیا تھا۔ اس نے بہت تعریف کی تھی اس کی۔ ان کی پارٹیز میں اکثر مدعو ہوتا ہے یہ... میں نے سوچا شاید آپ اس سے مل کر بہتر محسوس کرو گی مگر اس نے تو مجھے بہت ہی مایوس کیا ہے۔

لوئر مڈل کلاس لوگوں کی طرح باتیں کر رہا تھا۔ ”سیٹھ کریم ڈاکٹر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا اور وہ خاموشی سے باہر دیکھنے میں مگن تھی۔

گاڑی مہران اسٹریٹ پر آچکی تھی۔ رانی کو پیپل کا وہ درخت اب نظر آنے لگا تھا جہاں سے راستہ ان کے گھر کی طرف مڑتا تھا۔ گاڑی لمحہ بہ لمحہ درخت کے قریب ہوتی جا رہی تھی اور اب اس درخت کے نیچے بنا جھونپڑی نما ہوٹل بھی نظر آنے لگا تھا۔

موٹر پر پہنچ کر گاڑی پیپل کے درخت کے پیچھے سے ہوتی ہوئی چھپر ہوٹل کے سامنے آئی جب اچانک گاڑی کے بونٹ پر پانی کا ایک زور کا چھینٹا پڑا۔

سیٹھ کریم نے فوراً بریک پر پاؤں رکھ کر گاڑی کو روکی۔

رانی نے سر گھما کر چھپر ہوٹل کی طرف دیکھا جہاں سے گاڑی پر پانی پھینکا گیا تھا۔

بیس بائیس سال کا ایک لمبا بڑا سا نولے رنگ کا لڑکا خالی گلاس ہاتھ میں پکڑے ہکا بکا کھڑا تھا۔ رانی کو اس کی شکل پر صاف لکھا ہوا نظر آ رہا تھا کہ اس حادثے میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ گاڑی کو مڑتے ہوئے دیکھ نہیں پایا اور اپنی جھوک میں پانی کا گلاس ہوٹل کے سامنے کچی پکی سڑک پر انڈیل رہا تھا۔

دفعۃً رانی کو گاڑی کا دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کے دیکھا تو اس کا باپ شدید غصے میں گاڑی کے آگے سے ہوتا ہوا چھپر ہوٹل کے سامنے ششدر اور

پریشان کھڑے لڑکے کے پاس جا رہا تھا۔ اس نے دوبارہ بے چینی سے لڑکے کی طرف دیکھا جو ابھی تک وہیں ساکت تھا اور اسی لمحے اس لڑکے کے منہ پر ایک زور کا تھپڑ پڑا۔

رانی اپنی جگہ پر سن ہو گئی تھی۔

وہ اپنے باپ کے غصے سے اچھی طرح واقف تھی جو گھر کے ملازمین کو کئی بار اس کے سامنے چھوٹی چھوٹی باتوں پر پیٹ چکا تھا۔

وہ سر جھکائے اپنے پاؤں گھورنے لگی تھی۔ اس میں اب اتنی ہمت نہیں تھی کہ دوبارہ اس بے قصور لڑکے کی شکل دیکھ پاتی۔

باہر چار پانچ لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ ایک گنجا اور بڑھی ہوئی توند والا کریم صاحب کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہہ رہا تھا۔

”اس سے غلطی ہوئی گئی صاب... اسے معاف کر دو یہ آج ہی گاؤں سے آیا ہے۔“

پھر وہ لڑکے کی طرف دیکھ کر غصے سے بولا۔

”چل اوئے... معافی مانگ صاب سے۔“

مگر لڑکا سر زمین کی طرف جھکائے روئے جا رہا تھا۔

”اوئے سن نہیں رہا تو... میں کیا کہہ رہا ہوں۔“

توند والے نے جو اس چھپر ہوٹل کا مالک تھا اور بھی اونچی آواز میں کہا۔

مگر سیٹھ کریم اب وہاں کھڑے ہو کر اس کی معافی کا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔

”بس بس... اس اندھے کو سمجھاؤ کہ یہ اس کا گاؤں نہیں کراچی ہے اور یہ گاڑی بیس لاکھ کی ہے۔ ساری پالش خراب کر دی الو کے پٹھے نے۔“

رعونت سے کہتے ہوئے سیٹھ کریم نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بڑبڑانے لگے۔

”جاہل... گنوار...“

منہ اٹھا کر آ جاتے ہیں شہروں میں اور اوقات کنویں کے مینڈک جتنی بھی نہیں ہوتی... ہونہم۔“

گاڑی آہستہ سے آگے بڑھی اور دو منٹ بعد گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔

رانی دروازہ کھول کر باہر نکلی اور پورچ سے نکل کر لاؤنج سے سیکنڈ فلور پر جاتی سیڑھیاں تیزی سے چڑھنے لگی۔ جب اسے اپنے باپ کی آواز سنائی دی۔

”ابھی کمرے میں مت جاؤ رانی۔ مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“

”موڈ نہیں ہے۔“ کہہ کر وہ بغیر رکے سیڑھیاں چڑھ کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ

اندر سے لاک کرنے کے بعد وہ بیڈ پر اونڈھی جا پڑی۔

تھوڑی دیر میں اس کا تکیہ پوری طرح بھیگ چکا تھا۔

اس کا باپ جس دن اس کے سامنے کسی پرہاتھ اٹھاتا، اُس دن اس کا تکیہ ضرور بھگتا تھا۔

☆...☆...☆

گیارہ جون بروز بدھ (2013ء)

میں شدید ذلت کے احساس سے دوچار تھا۔ زندگی میں پہلی بار یوں کسی نے میرے منہ پر تھپڑ مارا اور مجھے گالی دی تھی۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے اور میں بے

آواز روئے جا رہا تھا۔ مرتضیٰ مجھے کالر سے پکڑ کر اس کار والے سے معافی مانگنے کا کہہ رہا تھا اور میرے اندر اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ سر اٹھا کر کسی کی آنکھوں میں دیکھ سکوں۔

ہوٹل پر چائے پینے والوں کے ساتھ ساتھ سڑک پر پیدل چلنے والوں نے بھی یہ منظر دیکھا تھا۔ میری ٹانگوں سے چپکے ہوئے چھوٹو کو میں نے بار بار اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ ایک

وہی تھا جو اس وقت میری آنکھوں میں دیکھ سکتا تھا۔

کار والا مجھے تھپڑ مارنے کے بعد گالیاں بکتے ہوئے چلا گیا تھا۔

میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ اس شہر میں میرا پہلا دن اتنا بدترین ہو گا۔ مجھے رہ رہ کر اپنی

ماں کی یاد آرہی تھی۔ میں چاہتا تھا اڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں اور اسے بتاؤں کہ مجھ پر کیا

ہتی ہے، مگر یہ صرف میری خواہش تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ میری جیب میں واپسی کا کارایہ

تک نہیں تھا۔

اس کے جانے کے بعد کافی دیر تک مرتضیٰ مجھے سناتا رہا۔ چھوٹا بار بار میرے پاس آ جاتا اور کسی نہ کسی بہانے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کرتا، مگر میں اس سے بھی نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ غریبی جس پر مسلط ہوتی ہے، سب سے پہلے اس کی عزت نفس کو اپنا شکار بناتی ہے اور اکثر و بیشتر یہ کامیاب ہو جاتی ہے۔ لوگ جب ایک بار اپنی عزت نفس مار لیتے ہیں۔ ان کے لیے جینا آسان ہو جاتا ہے، مگر جو لوگ غربت کا شکار ہو کر بھی عزت نفس کو نہیں مرنے دیتے، ان کی زندگی کا ہر آنے والا لمحہ پہلے سے زیادہ کڑا اور صبر آزما بن جاتا ہے۔ یہ عزت نفس کو بچاتے ہیں تو دنیا انہیں جینے نہیں دیتی اور مار دیتے ہیں تو خود جی نہیں پاتے۔ عزت نفس کا تقاضا تھا کہ مجھے ابھی مرتضیٰ کے منہ پر تھوک کر واپس گھر چلے جانا چاہیے یا کہیں اور جا کے رہنا چاہیے۔

مگر میری غریبی مجھ سے کچھ اور ہی کہتی تھی۔ اس دن مجھے اپنی غربت سے سخت نفرت ہو گئی تھی۔ میں دل ہی دل میں کبھی اپنی قسمت سے جھگڑتا، تو کبھی اپنے مرے ہوئے باپ کو کوسنے لگتا جس نے مجھے پیدا کر کے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ کبھی میں اللہ سے شکوہ کنتاں ہو جاتا، تو کبھی دنیا سے... بے بس انسان صرف خود سے لڑ سکتا ہے، میں بھی خود سے لڑ رہا تھا۔ اپنی کم مائیگی کا، اپنی بے وقعتی کا احساس مجھے کھائے جا رہا تھا۔ میں نے کئی بار دل میں تہیہ کیا... میں ابھی جا کر اس مرتضیٰ نامی آدمی سے کہوں گا ”تم ہوتے کون ہو مجھ سے معافی منگوانے

والے؟ تم کیا اندھے تھے؟ دیکھ نہیں رہے تھے پانی انڈیلتے وقت میں سڑک پر نہیں دیکھ رہا تھا؟ اور مجھے سڑک پر پانی پھینکنے کا کس نے کہا؟ تم نے کہا... اور اس کا روالے کے سامنے بھیگی بلی بن کر الٹا مجھے ہی کوسنے لگے تھے۔ میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر اور تمہارے اس گھٹیا ہوٹل پر جسے دیکھ کر لوگ تھوکتا بھی پسند نہیں کرتے۔

میں نے یہ بھی سوچا کہ میں ابھی اس کا روالے کی محل نما کوٹھی پر پہنچ جاؤں اور اس کے گھر میں گھس کر اسے چار پانچ تھپڑ مار کر اپنا بدلہ اتار لوں، مگر میں صرف سوچ سکتا تھا۔ سچ یہ تھا کہ میں تھپڑ اور گالیاں کھانے کے بعد اب چائے کی گندی پیالیاں دھو رہا تھا اور بار بار اُٹنے والے آنسوؤں کو بے دردی سے پونچھ رہا تھا۔

رات کے دس بج چکے تھے۔ ہوٹل کے آس پاس چہل پہل کم ہو گئی تھی، مگر مہران اسٹریٹ پر ٹریفک اب بھی پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ مرتضیٰ نے مجھے اور چھوٹو کو لوہے کے پنج، کرسیاں اور ٹیبل اکٹھے کر کے اندر رکھنے کو کہا اور خود دھپٹے پر پاؤں پسار کر لیٹ گیا۔ میں نے چھوٹو کے ساتھ مل کر ہوٹل کے تمام پھیلاوے کو سمیٹنے کے بعد چھوٹو کو لیٹ جانے کو کہا۔

”آپ بھی سو جاؤ بھاجی... دن میں بھی ٹھیک سے آرام نہیں کیا۔“

چھوٹو نے میری آنکھوں کی سوجن سے نظریں چرا کر کہا تھا۔

”نہیں یار... مجھے ابھی نیند نہیں آئے گی تو سو جا۔“

میں نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ میری آواز نہ بھیگے مگر میرا لہجہ خود بخود ہی گلوگیر ہو گیا۔

”بھاجی اس کاروائے کو آپ کو تھپڑ نہیں مارنا چاہیے تھا۔ آپ کی غلطی نہیں تھی۔“
میں نے چھوٹو کی بات سنی، مگر کچھ کہنے سے گریز کیا۔

”پر آپ چنانچہ کرو بھاجی... وہ روز رات کو دیر سے گزرتا ہے یہاں سے جس دن مجھے موقع مل گیا، ایک شیشہ بھی ثابت نہیں رہنے دوں گا اس کی گاڑی کا۔ ڈھونڈتا پھرے گا اندھیرے میں پھر کہاں سے پتھر آیا اور کس نے مارا؟“

چھوٹو غضبناک ہو رہا تھا۔ میں نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

”نہیں چھوٹو... پھر اس میں اور ہم میں کیا فرق رہ جائے گا؟“

چھوٹو نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔

”تو بھاجی یہی تو میں چاہتا ہوں کہ فرق نہ رہے اس میں اور ہم میں۔ اس نے آپ کو تھپڑ مارا، آپ اور میں مل کر اس کی گاڑی کے شیشے توڑ دیں گے۔ تب آپ کو رونا نہیں آئے گا جیسے اب آرہا ہے۔“

چھوٹو نے اپنے تئیں بہت سمجھداری کی بات کی تھی اور اب مجھے داد طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”نہیں چھوٹو! ہم ایسا کچھ بھی نہیں کریں گے جس سے مرتضیٰ چاچا کے لیے کوئی مصیبت کھڑی ہو۔“

میں نے چھوٹو کو اس کے ارادوں سے باز رہنے کے لیے کہا۔ اس نے جو کہا تھا وہ کر سکتا تھا، مگر میں جانتا تھا کہ اس طرح مرتضیٰ کا یہ چھپر ہو ٹل بند ہو جائے گا اور ایسا میں نہیں چاہتا تھا۔

”استاد تو خود مصیبت ہے بھاجی... مجھے کئی بار بلا وجہ پیٹ چکا ہے۔ ایک دو بار تو گاہکوں سے بھی پٹو اچکا ہے اور ایک بار مجھ سے راستے میں دودھ گر گیا، تو پورے ایک گھنٹے تک یہاں سڑک پر مرغابنائے رکھا اور مہینے کے بعد تنخواہ میں سے پیسے بھی کاٹ لیے۔ بھاجی یہ رشتے میں میرا دور کا ماموں لگتا ہے۔ میرے اماں ابا کے مرنے کے بعد اس نے برادری میں سب کے سامنے میرا ذمہ اٹھایا تھا۔ تب میں سمجھا تھا کہ یہ مجھے میرے ماں باپ کی طرح رکھے گا، مگر دو مہینے بعد یہ مجھے یہاں لے آیا۔“

چھوٹو کے انکشافات دل دہلا دینے والے تھے۔ وہ یتیم اور بے آسرا بچہ مرتضیٰ جیسے گھٹیا آدمی کے رحم و کرم پر تھا۔ میں نے اس کے گال تھپتھا کر اسے سونے کے لیے کہا اور خود ہولے ہولے کچے کچے رستے پر چلنے لگا۔ تھکاوٹ کے باوجود نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی، مجھے رہ رہ کر وہ منظر یاد آرہا تھا جب کاروائے نے مجھے تھپڑ مارا۔ مجھے اس کی گالیاں بھی یاد آرہی تھیں۔ خود کو اکیلا پاتے ہی میں نے اونچی آواز کے ساتھ رونا شروع کر دیا۔ میری

بچی بندھنے لگی اور میں مسلسل رو رہا تھا۔ کبھی کبھی سامنے سے کوئی گاڑی آتی تو دو سیکنڈ کے لیے میرا متورم چہرہ روشن ہو جاتا مگر مجھے اب پروا نہیں تھی۔ میں ایک ہی بار کھل کر رو لینا چاہتا تھا تاکہ آنے والے دنوں کی کٹھنائیاں آسانی سے برداشت کر سکوں۔ شاید اس طرح میرے دل کا بوجھ کچھ کم ہو جاتا۔ چلتے چلتے میں کافی دور آچکا تھا۔ میرے بائیں طرف لوہے کی تار سے بنی ہوئی باڑھ شروع ہو گئی۔ یہ اس ایریا میں بنے ہوئے پارک کی حد بندی کے لیے لگائی گئی تھی۔ باڑھ کے ساتھ ہی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سیمنٹ کے بنے ہوئے پنج تھے جہاں شام کے وقت لوگ بیٹھ کر گپیں ہانکتے تھے۔ میں سڑک کے بچوں بچے چلتے ہوئے اب باڑھ کر اس کر کے پنج تک پہنچنا چاہتا تھا۔ جب سامنے سے آنے والی گاڑی نے مجھے سڑک کی دوسری طرف جانے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ہیڈ لائٹس کی روشنی سے بچنے کے لیے سڑک کی دائیں طرف دیکھا جہاں وقفے وقفے سے کوٹھیاں بنی ہوئی نظر رہی تھیں۔ میری نظریں تھوڑی دیر کے لیے اس محل کے مین گیٹ پر آویزاں روشن بورڈ پر ٹک گئیں جس پر جلی حروف میں ”کریم پیلس“ لکھا ہوا تھا۔

گاڑی گزر چکی تھی۔ میں نے سڑک کی بائیں طرف جا کر باڑھ پھلانگی اور پنج پر جا کے بیٹھ گیا۔ میرے آنسو تھم چکے تھے۔

میں اس وقت بالکل خالی الذہنی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔

”ماں آج اکیلی سو رہی ہوگی۔“

تھوڑی دیر پنج میں بیٹھنے کے بعد میں نے یاسیت سے سوچا۔

”کتنی اداس ہوگی میرے بغیر، سو کہاں رہی ہوگی۔ کروٹیں بدل رہی ہوگی وہ بھی اور سوچ رہی ہوگی کہ اس نے مجھے شہر بھیج کر ٹھیک کیا یا غلط؟“

میں نے تصور میں ماں کا چہرہ لا کر اسے دیکھنے کی کوشش کی مگر سارے منظر دھندلا سے گئے، سب کچھ مکس ہو گیا۔

”یہ رات کیسے کٹے گی؟“

میں نے بوجھل دل سے سوچا تھا۔

کبھی کبھی وقت رک جاتا ہے۔ ہماری شدید خواہش کے باوجود ٹلنے کا نام نہیں لیتا۔ ہم طرح طرح کے جتن کر کے اسے دھکیلنے کی کوشش کرتے ہیں مگر یہ ہم پر مسلط ہو جاتا ہے۔ یہ رات بھی مسلط ہو چکی تھی۔ ٹلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ مجھے یہاں بیٹھے دو گھنٹے سے زیادہ ہو گئے تھے۔ آج کی تاریخ کل میں بدل چکی تھی۔

”ایک سیاہ دن کا اختتام۔“

میں نے نفرت سے زمین پر تھوکا۔

جیسے وہ دن تھوک بن کر میرے حلق میں اٹک گیا ہو۔

چھوٹے سے پارک کے پیچھے مہراں اسٹریٹ پر اب گاڑیوں کا ہجوم کم ہو چکا تھا اور میرے سامنے والا راستہ جو مر تفضی کے چھپر ہوٹل پر ختم ہوتا تھا بالکل سنسان اور تاریک ہو گیا تھا۔ ”میری زندگی بھی اس رستے کی طرح سنسان ہے۔“

اک اور مایوس سوچ..... سوچیں جب مایوس ہونے لگیں۔ یہ آپ کو زنگ آلود کر دیتی ہیں اور صلا حیتیں سلب کر لیتی ہیں۔

میں نوجوان تھا، تندرست بھی تھا، مگر ایک آزمائش بھرے دن نے میری سوچ میں مایوسی بھر دی تھی۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

آنکھیں بند کر لینے سے ہم تھوڑی دیر کے لیے اندھیرے میں چلے جاتے ہیں، ہر طرف اندھیرا اور رات کے بارہ بجے یہ اندھیرا اور بھی گہرا لگتا ہے۔

میں نے سانس لے کر سوچ کے نقطے کو زیر و پر لانے کی کوشش کی۔ میں گزرے ہوئے کل کو بھول کر ایک نیا دن شروع کرنا چاہتا تھا۔ جب میرے آس پاس گھاس پر بکھرے خشک پتے چرچرائے... میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

مہراں اسٹریٹ پر پارک کی پچھلی باڑھ کے ساتھ چند ساعتوں کے لیے ایک موٹر سائیکل رکا۔ دو کھنڈرے لڑکوں نے ٹارچ کی روشنی مجھ پر ڈالی اور زور سے سیٹی بجاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

میں نے اُن کے غائب ہونے تک موٹر سائیکل کا نظری تعاقب کیا اور ایک گہری سانس لی۔ جب ایک مدھم مگر پتھریلی آواز میرے بہت پاس سے سنائی دی۔ ”آئی ایم سوری۔“

میں نے چونک کر سامنے دیکھا۔ اندھیرے میں اک ہیولا سا کھڑا تھا۔ جیسے کوئی انسان ہو۔ اس کی آواز بھی انسانوں جیسی تھی۔

ہاں یقیناً!

لڑکیوں جیسی آواز تھی، مگر اس آواز میں انسان سے زیادہ کسی روبروٹ کا...

کسی کمپیوٹر انڈر ریکارڈڈ آواز کا گمان ہوتا تھا۔

میں بے اختیار اُچھل کے کھڑا ہو گیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس انجان جگہ پر ایک سنسان پارک میں رات کے بارہ بجے میرے علاوہ اور کون قسمت کا مارا ہو سکتا تھا؟

کوئی پاگل؟ یا پھر مافوق الفطرت وجود...

مجھے بچپن میں ماں کے سنائے ہوئے تمام بھوت پریت کے قصے اور کہانیاں یاد آنے لگیں۔

”کون؟“

میں بوکھلاہٹ میں صرف اتنا ہی کہ پایا۔

وہ ہیولا خاموش کھڑا تھا۔ نہیں... کھڑی تھی۔ اس کے بال اور دوپٹا بتاتے تھے کہ وہ کوئی لڑکی ہو سکتی تھی۔ یا کوئی بچھل پیری...

میں نے گھبرا کر اس کے پیروں کی طرف دیکھا اور سکھ کا سانس لیا۔ وہ بچھل پیری نہیں تھی۔

پروہ جو بھی تھی اس نے چند لمحوں کے لیے مجھے گزرے ہوئے تاریک دن سے باہر نکال لیا تھا۔

اور یہی تو میں چاہتا تھا۔

☆...☆...☆

گیارہ جون بروز بدھ (2013ء)

تکیہ پوری طرح بھیگ چکا تھا۔ مگر اس کی تسلی اب بھی نہیں ہو پارہی تھی۔

حساس لوگوں کی سب سے بڑی مشکل یہی ہے۔ یہ ہمیشہ ان باتوں پر اٹک جاتے ہیں جو دنیا کے لیے ”اک ذرا سی بات“ ہوتی ہیں۔

بات اک ذرا سی تھی۔ اس کے باپ نے چھپر ہوٹل کے فقیر جیسے حلیے والے لڑکے کو تھپڑ مار دیا تھا اور اب سکون سے ٹی وی دیکھ رہا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ ”اک ذرا سی بات“ تھی۔ مگر تکیہ اچھی طرح بھگو کر بھی لڑکے کا خوفزدہ چہرہ نہیں بھول پارہی تھی وہ حساس لڑکی۔ جو دکھنے میں دنیا سے بے نیاز تھی۔

اس نے کھڑے ہو کر دوپٹا اوڑھا اور دروازہ کھول کر تھرڈ فلور سے ہوتے ہوئے چھت پر اپنی مخصوص جگہ پہنچ گئی۔

کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔

وہی ٹریفک... وہی چلتے پھرتے لوگ... وہی سیٹیاں بجاتے موٹر سائیکل سوار... وہی نکلر پر استادہ پیپل کا درخت... اور اس کے نیچے بنا ہوا چھپر ہوٹل....

اس نے اندھیرے میں غور سے ہوٹل کو دیکھنے کی کوشش کی مگر کچھ نظر نہیں آیا۔ اس سے پہلے کبھی یہ پیپل کا درخت اور یہ فقیروں کی جھگی جیسا دکھنے کا والا ہوٹل اس کی نظروں کا محور نہیں بناتا تھا۔

وہ خاموشی سے کھڑی ہو کر ٹریفک کو تنکے جایا کرتی تھی۔ مگر آج وہ اس ہوٹل کو بار بار دیکھ رہی تھی جس کے اندر وہ چہرہ موجود تھا۔ بچوں کی طرح سہا ہوا بے قصور اور معصوم چہرہ اور پھر اک زوردار تھپڑ اس کے کانوں میں گونجا۔

اس نے پلکوں کی جھلر سے ایک بار پھر اٹھ آنے والے ڈھیر سارے آنسوؤں کو روکنا چاہا۔ مگر آنسو اس کے اختیار میں صرف دنیا کے سامنے ہوتے تھے۔ تنہائی پاتے ہی بے لگام ہو جاتے تھے۔

ایک اجنبی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ ”آج ہی گاؤں سے آیا ہے صاب۔“
”کیا کیا خواب سجا کے آیا ہو گا گاؤں سے؟ پڑھنے کی عمر میں نوکری کرنے کے لیے آگیا۔ گھر والوں نے بھیجا ہو گا۔ گھر والے؟..... ماں باپ...
یہی تو ہوتے ہیں گھر والے۔ اور کون ہو سکتا ہے؟

میں اس کے بارے میں اتنا کیوں سوچ رہی ہوں؟ اور سب بھی تو تھے وہاں جب اسے تھپڑ پڑا تھا۔ سب کے سب میری طرح رو رو کر ہلکان تو نہیں ہو رہے ہوں گے؟ اتنا تو وہ خود بھی نہیں رویا ہو گا۔“ ذہنی روا سے بہائے لے جا رہی تھی۔

اس بہاؤ میں تب رکاوٹ پڑی جب اسے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں گھر کے باہر والی سڑک پر دور سے روتا ہوا ایک چہرہ نظر آیا۔

اسے لگایہ وہی ہے۔

گاڑی گزر چکی تھی، سڑک پر پھر سے اندھیرا چھا گیا، مگر وہ سست قدموں سے چلتا ہوا اس کے گھر کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔

رانی کی نظریں اندھیرے میں چلتے ہوئے ہیولے پر جم چکی تھیں اور پھر وہ عین اس کے گھر کے سامنے پہنچا جب ایک اور گاڑی گزری، ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اس نے اسے گھر کے گیٹ کی طرف ہوتے دیکھا۔ وہ پہچان چکی تھی کہ یہ وہی لڑکا تھا۔ لمبا تڑنگا سانولے رنگ والا جس نے قمیص کے دونوں بازو تب بھی فولڈ کیے ہوئے تھے اور اب بھی۔ گاڑی گزر جانے کے بعد وہ کریم پیلس کی مخالف سمت چلا گیا اور باڑھ بھلانگ کر پارک کے بیچ پر بیٹھ گیا۔ ”وہ رو رہا تھا؟“ اس نے حیرت سے سوچا اور پھر سے نظریں اس پر جمالیں۔

وہ اب دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ ”کیا اسے پتا ہو گا یہ اس شخص کے گھر کے دروازے کے باہر بیٹھا ہے جس نے آج اسے ذلیل کیا تھا؟“

”مجھے اس کے بارے میں اتنا نہیں سوچنا چاہیے۔“

اس نے سر جھٹک کر اس کا خیال دل سے نکالنے کی کوشش کی اور رفتہ رفتہ کم ہوتے ٹریفک کو دیکھنے لگی، مگر وہ خود بھی انجان تھی کہ وہ بار بار اسی بیچ کو دیکھ رہی ہے۔

”مجھے کیا کرنا ہے ابھی؟“ اس نے تنگ آ کر سوچا۔

”جیسے پہلے کرتی تھیں۔“

کوئی اس کے اندر سے بولا۔

”نہیں...“ اس نے اپنی ہی بات کو جھٹلاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”گھر میں رہنے والوں کی بات اور ہے۔ فاطمہ آنٹی، ان کا بیٹا اکبر.... کمال چاچا.... شکور

.... ان سب سے اور بات ہے۔ ان کے ہاتھوں میں پلی بڑھی ہوں میں ’ مگر ایک انجان

لڑکے سے پاپا کی غلطی کی معافی؟ نہیں یہ ٹھیک نہیں ہو گا۔“

وہ خود کو باور کر رہی تھی۔

”تو پھر ایسے ہی بے حس بن کر کھڑی رہو۔ جھوٹے ٹسوے مت بہاؤ۔“ اس کے اندر کی حد

درجہ ضدی لڑکی نے بے رحمی سے مشورہ دیا تھا اسے۔

”میں جھوٹے آنسو نہیں بہا رہی۔ مجھے سچ مچ دکھ ہے اس بے قصور لڑکے کی بے عزتی کا۔“

اس نے جھٹ سے اپنی سچائی بتائی تھی۔ ”تو پھر ثابت کرو کہ تمہیں دکھ ہے۔ جاؤ مانگ لو

معافی۔ تمہارا باپ تو کبھی نہ مانگے گا اس سے، اُلٹا اسے یہاں بیٹھا دیکھ کر اور بھی ذلیل کر

دے گا۔ موقع اچھا ہے۔ چپ چاپ جاؤ اور معافی مانگ کے واپس آ جاؤ۔ پہلے کی طرح بہتر

ہو جاؤ گی۔“

وہ چپ ہو گئی۔

اب اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ اپنی عدالت میں ایک بار پھر خود سے ہار گئی تھی۔

یہ بہت مشکل ہے۔ اپنی عدالت میں پیش ہونا۔

اپنے بے قصور ہونے کے لیے چیخنا چلانا اور پھر سچ کو تسلیم کر کے سر خم کر لینا۔

اپنی ہی عدالت میں اپنے ہاتھوں اپنی شکست لکھنے والی وہ لڑکی دنیا کی نظر میں مغرور اور اپنوں

کی نظر میں ذہنی معذور تھی اور یہی اس کا سچ تھا۔ کڑوا سچ....

اس نے دھیرے دھیرے سیڑھیاں اترنا شروع کر دیں تھیں۔

اس کے باپ کے کمرے کی لائٹ بجھ چکی تھی۔ گھر کے مین گیٹ پر پہنچی ’ تو ایک سائیڈ پر

رکھی کر سی پر او نگھتا ہوا کمال چاچا ہڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا ہوا چھوٹی مالکن؟“ اس نے اچنبھے سے پوچھا۔ اس نے کمال چاچا کو دیکھا۔

کمال چاچا نے اک بار گیٹ کھولنے میں ایک منٹ کی دیر کر دی تھی۔

اور اسی رات اپنے باپ کے کمرے کی لائٹ بجھنے کے بعد وہ اس کے پاس آئی تھی ’معافی

مانگنے۔

”مجھے باہر جانا ہے۔“

اس کے دو ٹوک انداز سے کمال چاچا اچھی طرح واقف تھا۔

”پر چھوٹی مالکن... اس وقت تو بہت دیر ہو گئی ہے۔ باہر سے کچھ لانا ہے تو مجھے بتادیں؟ اس نے ہچکچا کر کہا تھا۔

”میں باہر پارک تک جا رہی ہوں۔ پانچ منٹ میں واپس آ جاؤں گی۔“

اس نے کمال چاچا کی حیرانگی کو نظر انداز کر کے کہا۔ کمال چاچا پریشان ہو گیا تھا۔

”چلیں میں آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ شہر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں چھوٹی مالکن..... آپ اس وقت پارک میں؟

”چاچا آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ دروازہ بند کر دینا میں پانچ منٹ میں آ جاؤں گی۔“ اس نے رکھائی سے کہا۔

وہ ایسی ہی تھی۔ دوسروں کے لیے دل میں بلا کی نرمی رکھنے والی۔ مگر اپنے لیے پریشان ہونے والوں سے بری طرح پیش آنے آتی۔

اسے سب کچھ دکھاوا لگتا تھا۔

چاچا نے چاروناچار اسے باہر نکال کر دروازہ بند کیا۔ گھر کے باہر والا راستہ سنسان پڑا تھا۔ وہ باڑھ بھلانگ کر پارک میں گھس گئی۔ وہ اب اسے پنچ پر بیٹھا صاف نظر آ رہا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھ گود میں رکھے ہوئے تھے۔ سر جھکا تھا اور شاید... اس کی آنکھیں بند تھیں۔ آنکھیں نہیں دیکھ پائی تھی وہ۔ اس نے قدم آگے بڑھایا جو اندھیرے میں پڑے

ہوئے خشک پتوں پر جا پڑا۔ چرر کی آواز کے ساتھ اس نے سر اٹھایا مگر اس کی طرف دیکھنے کے بجائے گردن موڑ کے پیچھے مین روڈ پر دیکھنے لگا۔

تبھی ایک موٹر سائیکل پر سوار دو منچلوں نے ٹارچ کی روشنی میں پہلے اسے اور پھر پنچ پر بیٹھے لڑکے کو دیکھا۔

بس ایک ثانیے کے لیے اس نے ٹارچ کی روشنی میں اس کا سرخ چہرہ اور متورم آنکھیں دیکھیں تھیں۔

اور پھر منچلے سیٹی بجاتے ہوئے رفو چکر گئے۔

ان کے غائب ہونے تک وہ انہیں تکتا رہا۔

رانی اس کے قریب آچکی تھی۔ بالکل سامنے... اس نے ایک ثانیے کی خاموشی کے بعد کہا۔

”آئی ایم سوری۔“

لڑکے کو جیسے بچھونے کاٹ لیا۔ وہ ایک دم کھڑا ہو کر اندھیرے میں کھڑے اس کے وجود کو گھورنے لگا۔ تھوڑی دیر وہ بالکل ساکت و جامد رہا۔

اس نے محسوس کر لیا... اس کے خوف کو۔ مگر وہ خاموشی سے اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی۔

چند گھڑیوں تک شش و پنج میں گھرا رہنے کے بعد وہ بڑی دقت سے بولا۔

”کون؟“

☆...☆...☆

بارہ جون بروز جمعرات (2013ء)

”آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ پاپا نے غصے میں تھپڑ مار دیا۔ میں اس کے لیے آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں۔“

میں منہ کھولے ایک نیا تماشا دیکھ رہا تھا۔ میں جب سے اس شہر میں داخل ہوا تھا، میرے ساتھ سب کچھ عجیب اور ناقابل فہم ہو رہا تھا۔ کچھ بھی نارمل نہیں تھا۔ ایک چھوٹو کے علاوہ... پہلے گھر کی جگہ جھگی میں پہنچ گیا۔ پھر وہیں پر بیرا گیری کرنے لگا۔ پھر بلاوجہ کا تھپڑ اور گالیاں کھالیں اور اب رات کے بارہ بجے ایک انجان لڑکی جس کی شکل ابھی تک میں ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں پایا تھا۔ مجھ سے اپنے ناکردہ گناہ کی معافی مانگ رہی تھی۔

صورت حال عجیب تر تھی۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا اس کا دماغ ماؤف ہو جاتا۔ وہ چند ساعتوں تک میرے جواب کا انتظار کرتی رہی۔ مگر میں کچھ بولنے کی حالت میں نہیں تھا۔

ایک باپ... جو چھوٹی سی بات پر آپے سے باہر ہو کر تشدد پر اتر آتا ہے۔ گالیاں دیتا اور ناحق ذلیل کرتا ہے اور اس کی بیٹی رات کے بارہ بجے اچانک کہیں سے آٹپکتی ہے اور معافی تلافی کرنے لگتی ہے۔

میں بولتا بھی تو کیا بولتا۔ خاموش کھڑا رہا۔

”کیا آپ نے مجھے معاف کر دیا؟“ یہ انداز میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ معافی تلافی کا... جیسے کوئی ڈیوٹی سرانجام دی جا رہی ہو۔ کوئی بوجھ سر سے اُتارا جا رہا ہو۔ جیسے کوئی کہہ رہا ہو۔ ”میرا کام ختم ہو چکا ہے۔ کیا میں جاؤں؟“

میں نے اندھیرے میں اس کے چہرے کے مبہم نقوش دیکھے اور صرف اتنا دیکھ سکا کہ وہ مجھے دیکھ رہی ہے۔

”آپ نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔“ میں نے پست لہجے میں کہا۔

”مگر پاپا نے کی ہے۔ میں اس وقت گاڑی میں ان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ یہ ہمارا گھر ہے... کریم پیلس۔“ اس نے ہاتھ سے کریم پیلس کے مین گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”وہ آپ سے معافی نہیں مانگیں گے۔ وہ کسی سے معافی نہیں مانگتے۔ اگر انہوں نے آپ کو یہاں بیٹھے دیکھ لیا تو وہ آپ کو یہاں کام بھی نہیں کرنے دیں گے۔ آپ اُن کی غلطی معاف کر دیں۔“

وہ معافی مانگے جا رہی تھی مگر نہیں... وہ فرض نبھارہی تھی۔ بے تاثر لہجے میں، جیسے یہ کام اس کی ذمہ داری ہو اور اسے ہر حال میں کرنا ہو۔

”آپ نے مجھے کیسے دیکھا؟“ میں نے اچانک ذہن میں در آنے والا سوال پوچھا۔

”وہاں سے...“ وہ اپنے مخصوص مشینی انداز میں کہتے ہوئے مڑ کر ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی تین منزلہ کوٹھی کی چھت کا ایک کونہ دکھانے لگی۔

اس کے ہاتھ کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے میں نے چھت کا وہ کونہ دیکھا جہاں سے وہ مجھے اس پنج پر بیٹھا ہوا دیکھ سکتی تھی۔

”میں پچھلے دو گھنٹے سے آپ کو دیکھ رہی ہوں۔“ اس نے مزید کہا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں حساب کتاب لگایا۔ اس کا مطلب تھا وہ مجھے اپنے گھر والے رستے پر چلتا ہوا.... بلکہ چلنے کے ساتھ ساتھ دھاڑیں مار مار کر روتا ہوا بھی دیکھ چکی تھی۔ میں نے سر جھکا کر اندھیرے میں کالی نظر آنے والی سبز گھاس کو دیکھا۔

”یہ محض ہمدردی میں آگئی ہوگی۔ اتنی زور سے کسی کو روتا ہوا دیکھ کر تو کوئی بھی پسچ سکتا ہے۔ پر اس لڑکی میں کچھ نہ کچھ عجیب بھی ہے۔“ میں نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”آپ جائیے۔ اگر آپ کے پاپا نے آپ کو یہاں دیکھ لیا، تو وہ مجھے گولی مار دیں گے۔“ جو شخص اپنی گاڑی کے بونٹ پر ایک گلاس پانی برداشت نہیں کر سکتا، وہ اپنی بیٹی کے ساتھ پانی پھینکنے والے چھپر ہوٹل کے میرے کو کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ وہ بھی رات کے اس وقت... پارک میں۔ وہ کوئی سوال جواب کیے بغیر مجھ پر ایک عدد گولی ضائع کر سکتا تھا۔

پر وہ انجان اور عجیب لڑکی ابھی تک معافی پر انکی ہوئی تھی ”آپ نے مجھے معاف کر دیا؟“ ”آپ نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی اس لیے آپ کو مجھ سے معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

اور یہ صحیح بھی تھا۔

”اوکے۔ آپ نے پاپا کی غلطی کو معاف کر دیا؟“

کمال مہارت تھی اسے صرف لفظوں کی حد تک رہنے کی۔ میں نے اتنے پتھر پلے انداز میں کم از کم کسی لڑکی کو اس سے پہلے بات کرتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ اس پر وقت اثر انداز ہو رہا تھا اور نہ ماحول۔ وہ بے نیاز تھی کہ وہ انجان لڑکے کے پاس تنہا کھڑی ہے۔ وہ بے خبر تھی کہ پارک کے کچھوٹے مین روڈ سے گزرنے والا ہر موٹر سائیکل سوار اسے دیکھ کر کیا سوچ رہا ہے۔ وہ صرف ایک ہی بات پر مصر تھی۔ جیسے جو ٹھان کے آئی تھی اسے کر کے ہی جائے گی

جیسے کوئی ضدی کر سکتا ہے یا پھر کوئی بہت مجبور.... اور میرے خیال میں وہ مجبور بالکل بھی نہیں تھی۔

”آپ کے پاپا کی غلطی کی معافی آپ پر فرض نہیں ہے۔“ مجھے اس پر کوئی رحم نہیں آیا تھا۔ آج بھی کیسے سکتا تھا؟ میرے خیال میں مجھ سے زیادہ قابل رحم تو اس دن پورے شہر میں کوئی نہیں ہو گا۔ مگر اس کی ایک ہی جون اب مجھے حیرانگی سے زیادہ غصہ دلانے لگی تھی۔ سمجھتی کیا تھی وہ؟ کہ وہ چل کے میرے پاس آجائے گی اور میں اس کے اس احسان کے بدلے اس کے بد مزاج اور مغرور باپ کو معاف کر دوں گا اور اس کا ممنون و مشکور ہو جاؤں گا۔

”وہ میرا اور پاپا کا معاملہ ہے۔ آپ بس انہیں معاف کر دیجیے۔“

بے تکی انداز میں بولتی ہوئی مجھ سے چار فٹ کے فاصلے پر کھڑی لڑکی اب میرا امتحان لینے لگی تھی۔

”آپ کا اور آپ کے پاپا کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ میرا اور آپ کے پاپا کا معاملہ ہے۔ آپ خواہ مخواہ بیچ میں آرہی ہیں اور آخر آپ کو آنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ آپ کے امیر کبیر پاپا کے سامنے میری اوقات کسی بھیک منگے سے زیادہ نہیں ہے۔ میں اگر آپ کے پاپا کو معاف نہیں بھی کروں گا تو ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ نجانے اب تک میرے جیسے کتنوں کو تھپڑ مار چکے ہوں گے آپ کے گریٹ پاپا۔ آپ کیا سب کے پاس جا کر معافی نامہ لکھوا لیتیں ہیں ان کے

لیے؟ آپ کو اگر اپنے پاپا اتنے ہی پیارے ہے، تو ان کے ستائے ہوئے لوگوں سے زبردستی معافی وصول کرنے کے بجائے اپنے پاپا کو انسانیت کا سبق پڑھانے کی کوشش کیجیے۔ میں نے کون سا اتنا بڑا جرم کر دیا تھا کہ یوں درجنوں لوگوں کے بیچ آپ کے پاپا نے مجھے تھپڑ مار دیا اور صرف ہاتھ نہیں چلایا۔ زبان بھی چلائی تھی انہوں نے۔ آپ اگر وہاں تھیں تو سنا بھی ہو گا آپ نے... میرے مرے ہوئے باپ کو گالیاں دی ہیں آپ کے اچھے پاپا... میرے ماں باپ نے آج تک کسی انسان کو تو کیا کبھی کسی جانور کو بھی گالی نہیں دی۔ میں نے اپنے باپ کے مرتے دم تک ان کے منہ سے کسی کے لیے اتنے بے ہودہ الفاظ نہیں سنے جتنے آج آپ کے پاپا کے منہ سے اپنے لیے سنے ہیں۔ تھپڑ مارنا تو بہت دور کی بات ہے، میرے لیے یہ سب کچھ نیا ہے محترمہ۔

مگر آپ کے پاپا اور شاید آپ جیسے لوگ کبھی اس احساس کو سمجھ ہی نہیں پائیں گے۔ میرے باپ نے مجھے آپ جیسی شاندار زندگی نہیں دی مگر وہ مجھے عزت نفس کے معنی سمجھا گیا ہے۔ اسی لیے آج اذیت سے گزر رہا ہوں۔ آپ کیا جانیں عزت نفس مجروح ہو جائے تو کیسا لگتا ہے؟ آپ کو بھرے بازار میں کبھی کسی نے تھپڑ مارا ہوتا تو آج آپ یوں مجھے روتے دیکھ کر اپنے پاپا کے لیے معافی نامہ لکھوانے نہ آجائیں، آپ کبھی میرا سامنا ہی نہ کرتیں مگر آپ انجان ہیں اس کیفیت سے جس سے میں دوچار ہوں۔ آپ نے سوچا ٹو پونجیا ہے۔

تین لفظ منہ پر مار کر اپنے شاندار پایا کے لیے معافی چھین کر لے آؤں گی۔ جائیے نہیں کرتا معاف آپ کے پایا کو۔ میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اسی لیے میں انہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ میں پھٹ پڑا تھا۔

گزرے دن کی سب تلخیاں... جو ایک غبار کی شکل میں میرے اندر جمع ہو چکی تھیں۔ اب بھاپ بن کر باہر آرہی تھیں۔

میں چلا اٹھا۔ اس شہر میں آکر پہلی بار کسی پر چلایا تھا۔ کس پر؟ جو مجھ سے بنا تصور کے معافی مانگنے آگئی تھی۔

میں نے اس کے ساتھ لگ بھگ وہی کر ڈالا جو اس کے باپ نے میرے ساتھ کیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہاں دیکھنے اور سننے والے تھے۔ مگر یہاں کوئی نہیں تھا سوائے اس کے۔

اب صرف تھپڑ مارنے کی کسر رہ گئی تھی۔ بات کرتے کرتے میں ہانپنے لگ گیا تھا۔ میں نے پھر سے پنج پر بیٹھ کر مجرموں کی طرح سر جھکا کر میری کڑوی کیسلی سننے والی انجان لڑکی کو دیکھا۔ وہ ابھی تک اس انتظار میں کھڑی تھی کہ شاید میں کچھ اور بولوں گا اور اسے اس طرح جھکے سر کے ساتھ اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر مجھے بولنا ہی پڑا۔

”دیکھیں محترمہ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے میرے جیسے معمولی آدمی سے معافی مانگ کر اپنا بڑا پن دکھایا۔ مجھے آپ سے نہ پہلے کوئی شکایت تھی اور نہ اب ہے۔ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ کر یہاں سے چلی جائیں کیونکہ اگر آپ نہ گئیں تو مجھے واپس اپنی کٹیا میں جانا پڑے گا جہاں ابھی دو تین گھنٹے تک جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

میری بات کے جواب میں جو اس نے کیا۔ وہ میری توقع کے بالکل ہی برعکس تھا۔ وہ ہولے ہولے چارنٹ کا فاصلہ ختم کر کے میرے پاس پنج پر آ بیٹھی۔ تھوڑا سا فاصلہ رکھ کر -

اس کا چہرہ اور بھی واضح ہوا گیا۔ میں نے ایک طرف سمٹتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ اسے حسین کہا جاسکتا تھا مگر میں اس کی بات سننے کے بعد اسے نفسیاتی مریضہ سمجھنے لگا تھا۔ ”آپ نے درست کہا۔ عزت نفس مجروح ہو جائے تو کیسا احساس ہوتا ہے یہ میں نہیں جانتی۔ میں شام کو ٹھیک اسی وقت آپ کے ہوٹل پر آؤں گی جس وقت آپ کو میرے پایا نے تھپڑ مارا تھا۔ آپ مجھے وہیں پر سب کے سامنے تھپڑ مار کر اپنا بدلہ اتار لینا مگر اس کے بعد آپ کو یہاں سے جانا ہو گا۔ اگر آپ کو پیسوں کا مسئلہ ہے تو میں دے سکتی ہوں۔“

واہ! کیا پریکٹیکل حل نکالا تھا اس نے۔ میرا دماغ گھوم گیا۔

”آپ یہ سب کیوں کر ناچاہتی ہیں؟“ میں نے حیرت سے اس خبیثی لڑکی کو دیکھا۔

”تاکہ آپ پایا کو معاف کر دیں؟“ وہی کمپیوٹر انرڈ آواز....
 ”کیا....؟“ ”تھپڑ کھانے کے بعد بھی آپ چاہیں گی کہ میں آپ کے پایا کو باقاعدہ معاف کروں؟ اس کی کیا ضرورت رہے گی تب؟“
 میں اسے سمجھنا چاہ رہا تھا اور جتنا چاہ رہا تھا۔ پہلے سے کہیں زیادہ الجھ رہا تھا۔
 ”ضرورت ہے۔ اسی لیے میں رات کو اس وقت آپ کے پاس آئی ہوں۔ اسی لیے آپ کی ساری باتیں خاموشی سے سن رہی ہوں اور اسی لیے آپ کو بدلہ اُتارنے کا موقع دے رہی ہوں۔“

”آخر ایسی کون سی بات ہے جو آپ میرے منہ سے اپنے پایا کے لیے معافی کا لفظ سننے کو اتنی بے چین ہیں؟“ مجھے پکارتیں ہو چلا تھا کہ یہ لڑکی کھسکی ہوئی ہے۔
 اور جو اس نے اب کی بار کہا تھا۔ میرے لیے ایک شاک تھا۔
 ”جس خود ترسی، بے وقعتی اور بے بسی کے احساس کو آپ پچھلے چند گھنٹوں سے جھیل رہے ہیں۔ اسے میں پچھلے پندرہ سال سے پال رہی ہوں۔ جانتی ہوں یہ احساس جب ہمارے ساتھ پلتا ہے، تو کیسا لگتا ہے۔ اسی لیے آپ کو اس کیفیت سے باہر نکالنا چاہتی ہوں جس کا شکار آپ انجانے میں میرے سامنے میرے پایا کی وجہ سے ہوئے ہیں۔ میں جتنا کر سکتی ہوں اتنا کر رہی ہوں۔ شام کو آؤں گی، آگے آپ کی مرضی۔“

یہ الفاظ کسی خبطی لڑکی کے نہیں ہو سکتے اور کسی کھسکے ہوئے دماغ میں سوچ بن کر نہیں ابھر سکتے تھے۔ ہاں، مگر پتھر کی طرح بے حسی سے کہہ جاسکتے تھے۔ جیسے اس نے کہہ تھے۔
 اور کہہ کر وہ رکی نہیں تھی۔ ایک جھٹکے سے اٹھی اور باڑھ کر اس کرتے ہوئے کریم پیلس میں داخل ہو اور میں صُمنِ نغم کی تصویر بنا اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆...☆...☆

بارہ جون بروز جمعرات (2013ء)
 وہ اسے حیرت زدہ چھوڑ کر واپس آگئی۔ وہ اس کی سوچ سے زیادہ حساس لڑکا ثابت ہوا، اسی لیے شدید ناراض تھا۔ اپنا اندر کا سارا غبار نکال کر بھی وہ پرسکون نہیں ہو سکا تھا۔ شدید احساس کمتری کا شکار لگتا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا وہ اس کی توقع کے خلاف ہوا تھا۔ ایک بار اس کے باپ نے فاطمہ آنٹی کے بیٹے کو پیٹا تھا اور جب وہ تلافی کی نیت سے اس کے پاس گئی تو اُلٹا وہ اس کے پاؤں پڑ گیا۔

”چھوٹی بی بی جی... آپ کے تو وہ صرف باپ ہیں، مگر میرے مائی باپ ہیں۔ وہ نہ ہوتے تو میری ماں مجھے لے کر نجانے کہاں کہاں دھکے کھاتی۔ آپ یوں اس طرح کر کے مجھے میری

نظروں میں شرمندہ مت کریں۔ میں صاب جی سے ناراض نہیں ہوں۔ وہ اپنے ہیں... ماریں گے ضرور، مگر چھاؤں میں بھی ڈالیں گے؟

”جو اپنا ہو گا۔ وہ مارے گا ہی کیوں؟“ دل ہی دل میں یہ سوچتے ہوئے خاموشی سے واپس آگئی تھی۔

کمال چاچا نے بھی اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”چھوٹی مالکن... وہ ہم پر خفا نہیں ہوں گے، تو کس پر ہوں گے؟ ہمارے اپنے صاب جی ہیں وہ۔ آپ ہم سے معافی مانگ کر ہمیں غیروں میں شامل مت کریں۔ ہم جب بھی دروازہ لیٹ کھولیں گے، صاب جی کو پورا پورا حق ہے ہم پر ناراض ہونے کا۔“

”اپنوں سے ناراض ہونے والے گالیاں دے کر ذلیل نہیں کیا کرتے کمال چاچا۔“ وہ کہنا چاہتی تھی، مگر اس کی ضرورت نہیں تھی۔

اس نے چھپر ہوٹل کے لڑکے کو بھی اکبر اور کمال چاچا کی طرح سمجھ لیا تھا۔ اس کے اندر کہیں یہ بات چھپی ہوئی تھی کہ اس کے پاپا کے خلاف بات کر کہ وہ اپنے لیے مشکل نہیں بڑھائے گا اور اکبر اور کمال چاچا کے جملوں سے ملے جلے الفاظ کہہ کر چپ ہو جائے گا، مگر ایسا نہیں ہوا۔

”کیا میں منافقت سے کام لے رہی تھی؟ اس نے خود سے سوال کیا۔ اپنی مخصوص جگہ پر کھڑے ہو کر۔

وہ اب تک بچ پر ہی بیٹھا تھا اور اسی طرف دیکھ رہا تھا، مگر اب وہ اس سے انجان تھی۔

”نہیں تمہیں واقعی دکھ تھا۔“ اسے خود سے جواب موصول ہوا تھا۔

”تو مجھے اکبر اور کمال چاچا کی باتیں کیوں یاد آرہی ہیں؟“ ایک اور سوال.....

”کیونکہ ان کے علاوہ تم آج تک کسی کے سامنے اپنے باپ کے گناہوں کو دھونے کے لیے پیش نہیں ہوئیں۔“ وضاحت آچکی تھی۔

”میں پاپا کی وجہ سے خود کو کیوں اس کے سامنے گرا رہی ہوں؟“ اس بار اس کے اندر چھپا ہوا منصف کچھ نہیں بولا تھا۔

اس نے نظریں گھما کر بچ کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی بیٹھا تھا۔

”اب کیا ہو گا؟“

”اب تم وہی کرو گی جو اس سے کہہ کے آئی ہو۔“

”اور اگر اس نے وہی کر ڈالا جو پاپا نے کیا تھا، تب؟“

”نہیں وہ ایسا نہیں کرے گا۔“

”تمہیں اتنا یقین کیونکر ہے۔ وہ بہت رنجیدہ ہے۔ شدید غصے میں بھی ہے۔ تم نے دیکھا میرے بار بار معافی مانگنے پر بھی اس نے پایا کو معاف نہیں کیا۔“

”تو تمہیں اب ڈر کس بات کا ہے؟“ اس کے اندر چھپا ہوا انسان جھنجھلا اٹھا تھا۔

”یہی کہ وہ تمہیں تھپڑ مار دے گا تو مار دے۔ یہی تو طے کر کے آئی ہو تم اپنی مرضی سے۔“

اب لوگوں کے سامنے ذلیل ہونے سے ڈرتی ہو؟“

”نہیں میں اس بات سے تو نہیں ڈر رہی۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”تو پھر کس بات کا خوف ہے تمہیں؟“

وہ سوچنے لگی تھی۔ واقعی مجھے کس بات کا خوف ہے؟ تاروں سے بھرا آسمان دیکھتے ہوئے

اس نے تھک ہار کر کہا۔

”پتا نہیں؟“

”سوچو....“ اس کے اندر کوئی زور دے کر بولا۔

”شاید مجھے فرق مٹ جانے کا خوف ہے۔“ کچھ پل تک سوچنے کے بعد اس نے با آواز بلند کہا

تھا۔

آسمان کو دیکھتے ہوئے جیسے اپنی بات تاروں تک پہنچانا چاہ رہی ہو۔ مگر اس کی بات خود اس

تک پہنچی تو جیسے کوئی گھسیٹا ہوا ایک بار پھر کٹھرے میں لے آیا تھا۔ سوالات کا ڈھیر لیے....

”تم ہوش میں ہو؟ اس کے اور تمہارے پایا کے درمیان کا فرق تو ویسے بھی نہیں مٹ سکتا۔“

تم کون سے فرق کو قائم رکھنا چاہتی ہو رانیہ کریم خان؟“

آسمان پر دو رکھیں ستاروں کی طرح دکھنے والا ایک سیارہ چلتے ہوئے بالکل ایسے لگ رہا تھا جیسے

وہ بھی ان انگنت ستاروں میں سے کوئی ایک ہو، مگر وہ ان سے الگ تھا۔ ان کے جتنا اونچا

نہیں تھا۔ چمکدار اور روشن بھی نہیں تھا۔ پر وہ چل سکتا تھا ستارے اور سیارے میں یہی تو

سب سے بڑا فرق ہوتا ہے۔ سیارہ چل سکتا ہے اور ستارہ نہیں چلتا۔

”کن سوچوں میں گم ہو جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔“

اسے کٹھرے میں لا کر سوالوں کی بوچھاڑ کرنے والی ہستی اسے چھوڑنے والی نہیں تھی۔

”ظرف کا فرق۔“

بہت سوچ سوچ کر اس نے خود کو جواب دیا تھا۔

”پاپا نے اسے بنا کسی قصور کے تھپڑ مارا، ذلیل کیا۔ یہ پایا کا ظرف ہے۔ اس نے مجھے بنا کسی

قصور کے تھپڑ مارا اور ذلیل کیا، تو اس میں اور پاپا میں کیا فرق رہا؟ اسے لگا اس نے بہت اعلیٰ

جواب دیا تھا مگر یہ جو اس کی سوچ کی لہروں میں چھپی ہوئی مخلوق تھی۔ نئے نئے سوالات

ڈھونڈ کر پریشان کرنا بہت پسند تھا اسے۔

”اوہ! ظرف کا فرق... تو تمہیں یہ خوف ہے کہ اس کا ظرف بھی تمہارے باپ کے جیسا نہ نکلے، کیوں... کیوں؟“

بہت چبا چبا کر بولی تھی اس سے حساب کتاب کرنے والی۔

”کیوں کہ وہ پہلا انسان ہے جس نے میرے سامنے میرے باپ کو غلط کہا ہے۔“ وہ اس نہج پر سوچتے ہوئے خود پر حیران ہو رہی تھی۔

”تو اس میں کیا انوکھی بات ہے؟ تمہارے باپ کے سامنے اسے غلط تو نہیں کہانا اس نے اور کبھی کہے گا بھی نہیں.... اور تم یہ کیوں چاہ رہی ہو کہ کوئی تمہارے باپ کو غلط کہے؟“

سوال ہی سوال تھے.... ”وہ جتنا غصے میں تھا۔ اگر باپا ہوتے تو ان سے بھی کہہ ڈالتا۔ اسے دھچکا لگا ہے‘ تو اس نے وہی کیا جو انسان کو کرنا چاہیے۔ وہ کمال چاچا کی طرح گالیاں کھا کر بھی سر جھکانے والوں میں سے نہیں ہے۔ وہ اکبر کی طرح انہیں اپنا مائی باپ نہیں مان رہا اور نہ ہی میری طرح پوری دنیا سے روٹھ کر اپنی ذات کی سسکتی ہوئی کوٹھڑی میں دبک کر بیٹھ گیا ہے۔ اس نے برملا کہا ہے کہ وہ کبھی انہیں معاف نہیں کرے گا۔“ وہ آج پہلی بار اپنی عدالت میں ہار ماننے کو تیار نہیں تھی۔

”تو....؟ مان لیا وہ غصے میں ہے۔ وہی کر رہا ہے جو کرنا چاہیے۔ رو رہا ہے، خود سے لڑ رہا ہے۔ تمہارے باپ کو غلط کہہ رہا ہے اور اسے معاف کرنے کو ہر گز تیار نہیں، تو کیا ہوا؟ تم اسے

اتنا اسپیشل کیوں بنا رہی ہو؟ کیوں کہ وہ تمہارے باپ سے نفرت کرنے لگا ہے یا اس نے تمہاری معافی تلافی کو ٹھکرا دیا ہے؟ اور اب تم یہ بھی چاہتی ہو کہ کل وہ تمہیں کچھ کہے بغیر تمہارے باپ کو معاف کر دے اور ان سے بلند ظرف رہے۔ کیوں؟ اس کا بلند ظرف تمہارے لیے کیوں ضروری ہے؟ تم تو باپا کا گناہ دھونے اور اسے بہلانے گئیں تھیں اور اب اسے دعوت تذلیل بھی دے آئی ہو تا کہ وہ اس کیفیت سے باہر نکلے جس کا تم شکار ہو! اوہ! تم یہ کیوں چاہتی ہو کہ وہ اس کیفیت سے نکل آئے؟ وہ ایسا محسوس نہ کرے جیسا تم کرتی ہو؟ کیوں۔ تمہارا باپ تمہیں یوں ہی ڈاکٹرز کے پاس نہیں لے کر جا رہا۔ تمہیں سچے ڈاکٹرز کی ضرورت ہے۔ تم اپنے حواس کھو چکی ہو۔ اپنے اس باپ پر ایک معمولی لڑکے کو فوقیت دے رہی ہو جس نے تمہیں شہزادیوں جیسی زندگی دے رکھی ہے۔“

سوالات کی بارش تھی۔ اب تو اس کے اندر چھپی ہوئی نامعلوم ہستی اسے پاگل بھی قرار دے چکی تھی۔

”میں تمہارے سب سوالوں کے جواب اس آنے والی شام کے گزر جانے کے بعد دوں گی۔“

اس نے اندر سے اٹھتی آوازوں کو دبانا چاہا۔

”تم غلط کرنے جا رہی ہو رانیہ کریم خان۔“

سوال کرنے والا اب اسے وارننگ دے رہا تھا.... تنبیہ کر رہا تھا۔ ”مگر پہلے تو تم نے کہا تھا کہ مجھے جانا چاہیے اور تمہیں یقین تھا کہ وہ مجھے کچھ بھی نہیں کہے گا۔ میرا خوف بے بنیاد لگ رہا تھا تمہیں۔“ اس نے جیسے خود کو یاد دلایا تھا۔

”ہاں کہا تھا... کیوں کہ مجھے لگا تم اپنے باپ کے لیے اس کے پاس جا رہی ہو، مگر نہیں۔ تم اس کے لیے اس کے پاس جا رہی ہو۔ تم غلط راستے پر چل پڑی ہو۔ اس پر صرف ترس کھاؤ.... اسے راستہ مت بناؤ۔“

دل کے نہاں خانوں میں چھپا اس کا خیر خواہ اسے بار بار سمجھا رہا تھا یا ڈرا رہا تھا۔

”میں تھک چکی ہوں ترس کھاتے کھاتے۔ بچپن سے آج تک ترس ہی کھا رہی ہوں۔ تنگ آ گئی ہوں میں تم سے لڑتے لڑتے اور تمہارے آگے جھکتے جھکتے۔ آج زندگی میں پہلی بار میں اپنی تنہائی کو شدت سے محسوس کر رہی ہوں۔ کیا ہو جائے گا اگر وہ تمہارے معیار پر پورا نہ اترے۔ وہ بس میرے معیار پر پورا اتر جائے۔ میں اپنی تنہائی اس سے بانٹ لوں گی۔ میں اپنے خول کو توڑ ڈالوں گی جس میں پچھلے پندرہ سال سے تم نے مجھے قید کر رکھا ہے۔ وہ چیخ پڑی تھی۔“

”تم تو بہت بے نیاز ہو کر تیں تھیں؟ بہت الگ رکھتی تھیں خود کو دنیا سے۔ تم تو اپنی سالگرہ تک نہیں مناتیں۔ اپنی ماں سے بات نہیں کرتیں۔ باپ کے کمرے میں نہیں جاتیں اور آج صرف پانچ منٹ میں ہی ڈھیر ہو گئیں۔ اتنا ہار گئیں؟ اتنا کہ اسے خود سے اور اپنے باپ سے جتوا دینا چاہتی ہو۔ تم ایسی تو نہیں تھیں؟ یہ کیا ہو گیا تمہیں؟ واپس آ جاؤ۔ تمہارا باپ زندگی بھر اسے زمین پر ریگنے والے کیڑے سے زیادہ اہمیت زندگی بھر نہیں دے گا اور تم چلی ہو اس سے اپنی تنہائیاں بانٹنے۔ تم اس کے کندھے پر پاؤں رکھ کے اپنے باپ کو نیچا دکھانا چاہتی ہو؟ سیٹھ کریم خان کو ہرانے چلی ہو؟ اور اگر اس کا کندھا کمزور نکلا تب؟ دھڑام سے منہ کے بل گروگی تم اور تب شاید مجھے بھی منہ دکھانے لائق نہیں رہو گی۔ باز آ جاؤ.... رک جاؤ.... تم کنویں میں بیٹھے ہوئے مینڈک سے یہ توقع کر رہی ہو کہ وہ تمہاری زندگی میں روشنیاں بھر دے۔ تم بہت پچھتاؤ گی رانیہ کریم خان.... بہت۔“

سوچ کی لہروں سے بنا ہوا ان دیکھا وجود اسے شدت سے روک رہا تھا۔ باز آ جانے کو کہہ رہا تھا، مگر آج وہ پیچھے ہٹنے والی نہیں تھی۔

”وہ اگر سچ مچ کم زور نکلا...“

تو میں مر جاؤں گی اور میری تم سے اور اس دنیا سے جان ہی چھوٹ جائے گی۔“

”تمہیں انتظار کرنا چاہیے۔“

اس کے اندر چھپا ہوا وجود اب پست ہونے لگا تھا۔ جیسے ہارنے لگا ہو۔
”کس کا انتظار؟ پایا جیسے ہی کسی انسان کے ہونہار بیٹے کا انتظار جس کی پر اپرٹی میرے جتنی ہو جس کا گھر میرے جیسا ہو۔ جیسے وہ ہمدانی کا چمکو بیٹا؟ کیا وہ یا اس جیسا کوئی اور ساری زندگی سمجھ پائے گا مجھے؟ یا وہ بھی پایا کی طرح آدھی رات کو گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے ”ہائے کوئین“ کہہ کر غائب ہو جائے گا اور سمجھے گا اس نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ مجھے ایسے کسی اپنے کا انتظار نہیں کرنا جس کے پاس میرے لیے اپنا پن نہ ہو۔“ اس کے پاس ہر سوال کا جواب موجود تھا۔

”تو کیا وہ تمہیں سمجھ پائے گا جو نکل پڑے ہوئے چھپر ہوٹل کا ملازم ہے؟ جس کا اتنا پتا تم نہیں جانتیں جس سے زیادہ اچھی حالت میں تمہارے گھر کے نوکر ہیں۔ تمہیں تو اس کا نام بھی معلوم نہیں ہے اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں دھتکار دے۔ پانچ منٹ میں ایسا کیا جادو کر دیا اس نے کہ تم اسے اپنا نجات دہندہ سمجھ بیٹھی ہو؟“

اس کے خیر خواہ نے ایک آخری کوشش کی تھی۔ پھر سے اسے راہ راست پر لانے کی۔
دور کہیں سے اذان کی آواز آنے لگی تھی۔ اللہ اکبر..... اللہ اکبر.....

”میں جانتی ہوں وہ ستارہ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ سیارہ ہو یا پھر ٹوٹنے والا وہ تارا ہو جو صرف تھوڑی دیر کے لیے ہوا کو چیر کر چمک اٹھتا اور پھر ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتا ہے‘ تو کیا ہوا؟“

ختم تو آسمان پر سب سے ہوئے ستارے بھی ہو جاتے ہیں۔ ضروری تو نہیں کہ میں وہ تارا چنوں جسے پوری رات دیکھنا نصیب ہو۔ میں تو وہ ہوا بن جانا چاہتی ہوں جو تھوڑی دیر کے لیے کسی ٹوٹے ہوئے تارے کو چمکا دے۔ مجھے کسی ستارے کی آغوش میں بیٹھ کر پوری رات نہیں دیکھنی۔ مجھے صرف ٹوٹے ہوئے تارے کی تھوڑی دیر کی وہ چمک دیکھنی ہے جو صرف ہوا کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔“

اس نے نظروں کا زاویہ بدل کے دیکھا۔ وہ ابھی تک وہیں بیٹھا تھا اور اندھیرے میں لپٹے اس کے وجود کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس نے تاحد نظر پھیلے ہوئے آسمان کو دیکھا۔ رات کے آخری پہر ستارے اپنی سجاوٹ سے نرالی چھب دکھلا رہے تھے۔

اچانک ایک ٹوٹا ہوا تارا تھوڑی دیر کے لیے چمکا۔ تیزی سے زمین کی طرف آتا ہوا۔ شہاب ثاقب جس نے ایک پل کے لیے سب ستاروں کی چمک چھین لی اور دوسرے پل ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا تھا۔ رانی نے یہ منظر دلچسپی سے دیکھا تھا اور زندگی میں پہلی بار وہ کھل کر مسکرا اٹھی تھی۔

بارہ جون بروز جمعرات (2013ء)

میں پرویز گل۔ ایک مزدور کا بیٹا۔ جو گاؤں کے کچے مکان میں اپنی ماں کو تنہا چھوڑ کر شہر میں نوکری کی تلاش میں آیا تھا اور گزرے چند گھنٹوں کو بھلانے کے لیے وہ سب کچھ کر چکا تھا... جو میرے جیسے بے بس لوگ کرتے ہیں۔

مگر پھر نئے دن کی شروعات ہوتی ہے اور اس نئی تاریخ کے پہلے پانچ منٹ مجھے ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔

اک لڑکی آتی ہے اور میرے چھلنی وجود کے زخموں پر مرہم رکھنا چاہتی ہے۔

میں اس سے لڑ پڑتا ہوں اور اسے وہ سب کچھ کہہ ڈالتا ہوں جو شاید میں اس شہر میں کسی کو کہہ نہ پاتا۔

مگر وہ میری روح کو مندمل کرنے کے لیے وہ کچھ کرنے کو تیار ہو جاتی ہے جسے کوئی بھی ذی ہوش کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔

تو کیا وہ لڑکی سچ مچ پاگل تھی؟ میرے کانوں میں اب تک اس کے کہے ہوئے جملوں کی بازگشت سنائی دے رہی ہے۔ جو اس نے جاتے سمے کہے تھے۔

”جس خود ترسی، بے وقعتی اور بے بسی کے احساس کو آپ پچھلے چند گھنٹوں سے جھیل رہے ہیں۔ اسے میں پچھلے پندرہ سال سے پال رہی ہوں.... جانتی ہوں یہ احساس جب ہمارے ساتھ پلتا ہے تو کیسا لگتا ہے۔ اسی لیے آپ کو اس کیفیت سے باہر نکالنا چاہتی ہوں جس کا شکار آپ انجانے میں میرے سامنے میرے پاپا کی وجہ سے ہوئے ہیں۔ میں جتنا کر سکتی ہوں اتنا کر رہی ہوں۔ شام کو آؤں گی۔ آگے آپ کی مرضی۔“

اس کا دو ٹوک انداز بتاتا تھا اس نے جو کہا ہے وہ کرے گی مگر وہ کیسے خود ترسی میں مبتلا ہو سکتی تھی؟

کیوں کر بے وقعت ہو سکتی تھی؟ اور زندگی کا کون سا موڑ تھا جس نے اسے پندرہ سال سے بے بس کر رکھا تھا؟ میرے پاس ان تمام سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

میں نے اس کے باپ کے آگے گھگھاتے ہوئے مرتضیٰ کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اس ایریا کا نامی گرامی اور اثرورسوخ والا آدمی ہے۔ ایسے آدمی کی بیٹی جو اتنے شاندار محل میں رہتی تھی۔ آخر کون سا دکھ اپنے ساتھ پال رہی تھی؟

ان سب باتوں کے جواب تو صرف اسی سے مل سکتے تھے، مگر وہ مجھے کیوں کر بتاتی؟ وہ تو صرف اپنے باپ کے رویے پر پشیمان تھی۔

مگر نہیں... کچھ نہ کچھ الگ تھا اس لڑکی میں۔ میں سوچ سوچ کر تھکنے لگا تھا مگر اس کے بارے میں کوئی بھی حتمی رائے قائم نہیں کر پا رہا تھا۔

اسے گئے دس منٹ ہوئے تھے۔ اور میں ان دس منٹ میں پچاس بار اس مخصوص کونے کو دیکھ چکا تھا جہاں سے اس نے مجھے دیکھا تھا۔

اور پھر مجھے اندھیرے میں ایک مدہم انسانی ہیولا نظر آئی گی۔ یہ وہی ہو سکتی تھی۔

”پتا نہیں کیا سوچا ہو گا اس نے میرے بارے میں... کیسا لڑکا ہوں میں؟..... وہ مجھ سے اپنے باپ کی غلطی کی معافی مانگنے آئی تھی اور میں نے اسے بے نقط سنا کر ایک نئی آزمائش میں ڈال دیا۔ کیا ہوتا اگر میں وہ سب کہہ دیتا جو وہ مجھ سے کہلوانے آئی تھی۔ میں اگر اس کے باپ کو معاف نہیں بھی کروں گا، تو اسے کون سا فرق پڑے گا؟ اب وہ آنے والی شام کے بارے میں سوچ رہی ہوگی۔ ہو سکتا ہے اس نے جذبات کی رو میں آکر ایک بات کر دی ہو اور اب بچھتا رہی ہو، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

میں اب دل ہی دل میں پشیمان ہو رہا تھا۔ اس کا مدہم ہیولا ایک ہی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ پتا نہیں وہ وہاں کیوں کھڑی تھی۔ کیا سوچ رہی تھی۔

مگر میں اب یہ سوچ رہا تھا کہ وہ مرتضیٰ کے ہوٹل پر آگئی اور مجھے مخاطب کر لیا تو کیا ہو گا؟

مرتضیٰ میری جان کو آسکتا تھا اور بعید نہیں کہ وہ اس کے باپ کو بتادے۔ تب میں کہاں جاؤں گا؟

اس نے کہا تھا مجھ سے پیسے لے لو اور واپس چلے جاؤ۔ تو کیا میں اس لیے یہاں آیا تھا کہ ایک لڑکی سے واپسی کا کر ایہ پکڑوں اور دوبارہ گاؤں جا کر دھاڑیاں کرنا شروع کر دوں؟ نہیں.... یہ نہیں ہونا چاہیے۔

میں عجیب مشکل میں پھنس گیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے تک ساری دنیا سے نالاں جو کمزور کو عزت سے جینے کا حق بھی نہیں دیتی اور اب پریشان تھا کہ اسی دنیا کی ایک شاہانہ ٹھاٹھ سے رہنے والی لڑکی میرے ایسے معمولی لڑکے سے بے عزت ہونے کے لیے شام کو سرعام مجھے لکارنے والی تھی۔ ”کیا کرنا چاہیے؟“

میں اسے دیکھتے ہوئے سب کچھ بھول کر اب صرف یہی سوچ رہا تھا۔

رات دھیرے دھیرے آخری پہر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ شدید گرمی کے بعد چلنے والی ہلکی ہلکی ہو اگر گرمی کے احساس کو کافی حد تک کم کر رہی تھی اور میرا دماغ سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

کبھی ماں کی تنہائی کا احساس، کبھی باپ کو قبر میں اتارنے کا منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا، کبھی مرتضیٰ کا بے ہنگم وجود سوچ کر دماغ کھولنے لگتا اور کبھی گزری شام کا تھپڑ یاد آ جاتا۔

پھر ایک مبہم سا سراپا... جسے میں اب بھی وقفے وقفے سے دیکھ رہا تھا۔ بہت سارے سوالوں کو جنم دینے لگتا۔ سوچوں سے جنگ لڑتے لڑتے میں تب چونکا جب کہیں دور سے اذان کی ہلکی ہلکی آواز آنے لگی تھی۔

مجھے اس کا اتنی دیر تک جاگتے رہنا عجیب سا لگا تھا۔

”کسی سے بات کرتی ہو گی۔ گھر والوں سے چھپ کر... نہیں۔ تب وہ اتنی الگ اور مشکل نہ لگتی۔ رات کو گھر والوں سے چھپ کر بات کرنے والی لڑکیاں گھر والوں کی زیادتیاں نہیں دھویا کرتیں۔ ان کی غلطیوں کی معافیاں نہیں مانگتیں۔ کچھ تو انوکھا سا ہے اس میں؟“ دل خود ہی سوچ رہا تھا... خود ہی پلٹ رہا تھا۔

”خیر جیسی بھی ہو مجھے کیا؟ بس آج کی شام کوئی سین نہ بنا دے۔ ورنہ یہاں سے بوریا بستر گول۔“

یہ سوچتے ہوئے میں بیچ سے اٹھ گیا تھا اور باڑھ پھلانگ کر مہراں ٹاؤن کی اس کچی پکی سڑک پر چہل قدمی کرتے ہوئے میں واپس اپنی کٹیا کی طرف جا رہا تھا جو چند گھنٹوں بعد ڈھابا بننے والی تھی اور میں اس ڈھابے کا بیرا...

ماں نے کیا خوب انتظام کیا تھا اپنے لاڈلے کے لیے شہر میں۔ سب کچھ تو تھا یہاں... رہائش، کھانا پینا اور نوکری ڈھونڈنے کی تو ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔

مرتضیٰ جانے کب سے میرے ایسے کسی ہونہار ویٹر کے انتظار میں سوکھ رہا تھا اور اللہ کو جانے اس کی کون سی ادا پسند آگئی تھی اور مجھ سے جانے کون سی خطا ہو گئی تھی۔ جس کی سزا دینے کے لیے اللہ نے مجھے مرتضیٰ سے ملوایا تھا۔ مل تو دو اور لوگ بھی گئے تھے۔ ایک چھوٹا سا معصوم بچہ اور ایک بے حد عجیب لڑکی۔

لڑکی.....

میری عمر کے لڑکے جب کسی لڑکی سے اتفاقیہ ملاقات کر بیٹھتے ہیں تو انہیں وہ بس لڑکی لگتی ہے۔ عجیب ذرا بھی نہیں لگتی۔ مگر میرا معاملہ مختلف تھا۔

میں اپنی آرام گاہ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اتنا پاس کہ چوکور پھٹے پر بنیان پہن کر اپنی توند کی نمائش کرنے والے دنیا وافیہا سے بے خبر مرتضیٰ کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر سوتے چھوٹو کو بھی جو اس کے رویے سے شدید نالاں ہونے کے باوجود اب سوتے ہوئے اس کی موٹی بھدی ٹانگ سے بھالو کا کام لے رہا تھا اور ایک آوارہ کتاب جو کٹیا کے سامنے جانے کب سے پڑا اُونگھ رہا تھا۔

میں کتے کو جگانا نہیں چاہتا تھا مگر پانی کا وہ اکلوتا سرخ رنگ کا کولر جس میں دن کو گاہے گاہے برف ڈال کر گاہوں کو ٹھنڈا پانی فراہم کیا جاتا تھا۔ تین ٹانگوں والی میز کے اوپر رکھا تھا۔ میز کی چوتھی ٹانگ کب ٹوٹی ہو گی۔ اللہ جانے، مگر اس چوتھی ٹانگ کی غیر موجودگی میں پانی کا

گلاس بھرتے وقت ایک ہاتھ سے میز کو پکڑنا پڑتا تھا۔ میز کے نیچے کتنا خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا اور میں میز کے پاس کھڑا پلاسٹک کا گلاس جس میں جی ہوئی کائی نکالنے کا اس وقت میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تھامے سوچ رہا تھا کہ کیا ایسا کروں کے کتا بھی نہ جاگے اور میں اپنی پیاس بھی بجھالوں۔ میں ہولے سے زمین پر بیٹھا۔ ایک ہاتھ سے ٹیبل پکڑا اور دوسرے سے گلاس پکڑ کے ٹوٹی کے قریب لایا۔ اب ٹوٹی چالو کرنا سب سے مشکل مرحلہ تھا۔ گلاس والے ہاتھ کے انگوٹھے سے میں نے ٹوٹی کا بٹن دبایا۔ پانی پلاسٹک کے گلاس میں گرنا شروع ہوا۔ ہلکی سی آواز آئی اور کتا جاگ گیا۔ دوسرے لمحے اس نے بدحواسی میں وہاں سے بھاگنا چاہا اور میز کی ٹانگ اس کے راستے کی رکاوٹ بن گئی۔ لرزتی کانپتی کمزور ٹانگ کتے کی ٹکڑ برداشت نہ کر پائی اور اپنے ساتھ ساتھ ”دھڑام“ کی آواز کے ساتھ میز کو بھی لے کر زمیں بوس ہو گئی۔ پانی کا کولر میری ناک سے ٹکرایا، ادھ بھرا گلاس میرے ہاتھ سے چھوٹ کر لڑھکتا ہوا دور جا پڑا۔ میں نے پھٹی ہوئی ناک کے ساتھ کتے کو اندھیرے میں غائب ہوتے دیکھا جس کام کو کرتے وقت میں کتے کو نہیں جگانا چاہتا تھا۔ اس ادھورے کام نے مرتضیٰ کو ہڑبڑا کر جاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”کون ہے؟“

اس نے بے دردی سے چھوٹو کو ٹانگ سے پرے دھکیلتے ہوئے تیزی سے اٹھ کر کہا تھا۔

میں نے اپنے اوپر پڑے کولر کو ایک سائیڈ پر کیا اور جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میری ناک سے ہلکا سا خون بہ رہا تھا اور ماتھے پر بھی خراش کی وجہ سے جلن محسوس ہو رہی تھی۔

”او باؤ تم؟.... کیا شور مچا رکھا ہے آدھی رات کو.... اور یہ... یہ کیا؟ میز توڑ دی تو نے؟ کولر کا بھی ستیاناس مار دیا۔ تجھے کولر میں سے پانی ڈالنا بھی کسی نے نہیں سکھایا؟ آتے ہی نقصان کر دیا میرا۔ اب بھرے گا کون؟ تجھ سے تو کچھ بھی ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔ شام کو کریم صاب کی گاڑی پر پانی پھینک کر مجھے ان کے سامنے شرمندہ کروادیا اور اب ہوٹل میں توڑ پھوڑ شروع کر دی تو نے۔ خالد صاب نے تجھے میرے متھے مار کر توہے آزمائش میں ڈال دیا۔“

وہ دونوں ہاتھ نچانچا کر بولتا جا رہا تھا اور میں دل ہی دل میں کھول رہا تھا۔

چھوٹو بھی آنکھیں ملتا ہوا آکھڑا ہوا اور اب حیرت سے کبھی زمین پر اوندھی پڑی میز اور کولر کو دیکھ رہا تھا تو کبھی ہم دونوں کی طرف۔

”بھاجی.... آپ کی ناک سے خون نکل رہا ہے۔“

غور سے مجھے دیکھتے ہوئے اس نے بوکھلا کر کہا تھا۔

”ہاں تو اٹلے سیدھے ہاتھ مارے گا تو الٹا ہی ہو گا اس کے ساتھ۔ میرا نقصان بھی کر دیا اور اپنی ناک بھی پھوڑ دی جاہل نے۔“

وہ اب بھی جلے دل کے پھپھو لے پھوڑ رہا تھا مگر چھوٹو نے تیزی سے برتن میں پانی بھرا اور میرے پاس پہنچ کے بولا۔

”بھاجی آپ ادھر سر جھکا کے بیٹھ جاؤ.... میں سر پر پانی ڈالوں گا تو خون بہنا بند ہو جائے گا۔“
میں چپ چاپ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اس نے تھوڑا تھوڑا کر کے پانی میرے سر پر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔

”بھاجی رکا کہ نہیں؟“

وہ پانی ڈالتے ہوئے بار بار پوچھتا رہا تھا اور میری آنکھیں اک بار پھر نم ہونا شروع ہو گئیں تھیں۔

”بس کر دو چھوٹو خون رک گیا ہے۔“ میں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا اور کھڑا ہو گیا۔
وہ جانے کہاں سے ایک میلا کچیلّا تولیا لے آیا۔ میں نے تولیے سے سر خشک کیا۔ تبھی اسے میرے ماتھے پر پڑی ہلکی سی خراش بھی نظر آگئی۔

”بھاجی... آپ کا ماتھا بھی پھوٹ گیا۔“

اس نے بے اختیار بہت روانی میں کہا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس بھر کے اسے دیکھا۔

”واقعی یار چھوٹو.... ماتھا تو بہت برا پھوٹا میرا۔“

اس نے میری بات کو سمجھے بغیر تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں جی... اتنا زیادہ تو نہیں پھوٹا.. بس ہلکی سی خراش ہے۔ میرے پاس سنی پلاسٹ پڑا ہے میں لے کر آتا ہوں۔“

سنی پلاسٹ لگا کر میں نے ایک لمبی جماہی لی اور پھٹے پر جا کے بیٹھا ہی تھا جب کلی کرتے ہوئے مرتضیٰ کی آواز میرے کانوں میں الارم کی طرح بجی۔

”ساری رات سو سو کے تھکا نہیں تو تیری وجہ سے مجھے بھی ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ تو آج سے زمین پر ہی سو جایا کر۔ یہ کون سا جنگل ہے جہاں سانپ بچھو ہوں گے۔ آرام سے کپڑا بچھا کے سو جایا کر اب سونے کا وقت نہیں ہے۔ چل چھوٹو کے ساتھ مل کر بیچ اور کرسیاں باہر نکال اور سن لیو.... اب اگر کچھ ٹوٹا تو تیری تنخواہ سے کاٹ لوں گا۔ سویرے سویرے ہزار پندرہ سو کا ٹیکا لگا دیا تو نے۔“

میں منہ کھولے اس کی گل افشائیاں سن رہا تھا۔

بہت سارے سفید جھوٹ ایک ساتھ بول دیے تھے اس نے۔

نہ اس کی نیند میری وجہ سے خراب ہوئی تھی اور نہ ہی یہ تین ٹانگوں والی میز اور کولر ہزار پندرہ سو کے تھے۔ میں بس خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

”جنگل نہیں ہے پر جنگلی تو ہے۔“

میں نے خود کلامی کی تھی.... بہت دھیمی آواز میں۔

اذائیں کب کی بند ہو چکی تھیں اور اب صبح دھیرے دھیرے نمودار ہونے لگی تھی۔

میں نے ایک اور لمبی جماعتی اور سست قدموں سے چلتا ہوا ایک دوسرے کے اوپر ڈھیر کی طرح رکھی ہوئی کرسیوں کے پاس پہنچ گیا۔

آج میں نے اپنی پہلی باقاعدہ ڈیوٹی کا آغاز کیا تھا۔

☆...☆...☆

بارہ جون بروز جمعرات (2013ء)

وقت دھیرے دھیرے سرکتا جا رہا تھا اور رانی کی اپنے کمرے میں چہل قدمی تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔

اس نے ساری رات خود سے لڑتے ہوئے اور خود کو سمجھاتے ہوئے گزار دی تھی۔ اپنے اور

اس کے اسٹیٹس کا فرق، پاپا کی مخالفت، خاندان برادری والوں کی باتیں، پاپا کی سبکی اور ایک

احساس کمتری میں مبتلا لڑکے کی ٹوٹی پھوٹی شخصیت.... کچھ بھی اسے وہاں جانے سے روک

نہیں پارہا تھا۔

”احساس کمتری میں تو میں بھی مبتلا ہوں۔ اسے دنیا نے دھتکارا ہے۔ میں تو اپنوں کی

دھتکاری ہوئی ہوں، تو پھر ہمارے بیچ فرق کیسا؟“

”کیا کیا کیا.... خاندان برادری؟ خاندان برادری تب کہاں تھی جب میں اکیلی ماما اور پاپا کے بغیر اسکول اور کالج سے میڈلز لیا کرتی تھی۔ جب میں چار سال کی عمر میں اکیلی سوتی تھی؟“

”اوہ.... پاپا کی نیک نامی پر حرف آجائے گا؟“

کیوں کیوں کیوں.... جب وہ ساری ساری رات گھر سے غائب رہتے ہیں تب تو ان کی نیک

نامی میں کوئی فرق نہیں آتا اور زندگی میں پہلی بار کوئی دوست بناتے وقت میں ان کی نیک

نامی کے بارے میں سوچتی رہوں؟“

”میں آج شام اس سے ضرور ملوں گی اور اگر اس نے وہ نہ کیا جو پاپا نے اس کے ساتھ کیا تھا تو

بدلے میں اسے انعام ملے گا۔ مجھ سے دوستی کی صورت میں۔

”انعام تو تم سمجھ رہی ہو.... ہو سکتا ہے وہ نہ سمجھے۔“

”کیوں نہیں سمجھے گا؟“

کیا کمی ہے مجھ میں؟“

زندگی میں پہلی بار وہ اپنے کمرے میں رکھے ہوئے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود

کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

اس کے چہرے پر ٹین ایجرز جیسی بے فکری کی جگہ سنجیدگی کی گہری چھاپ ضرور تھی، مگر اسے ریجیکٹ کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ کم از کم اس کے لیے تو بالکل نہیں جس کے لیے وہ آج آئینہ دیکھنے پر مجبور ہوئی تھی۔

”کیا کر رہی ہو...؟“

”کیوں کر رہی ہو؟“

آئینے کے پار دکھنے والی لڑکی اچانک بولنے لگی تھی۔

وہ سمجھ گئی یہ وہی ہے جو پچھلے پندرہ سال سے اسے اپنی انگلیوں پر نچاتی آئی تھی۔ جب بھی وہ زندہ انسانوں کی طرح جینے کی کوشش کرتی تھی۔ یہ اپنی عدالت لگا کر اسے ہر ادیتی تھی اور اپنی باندی بنا کر دنیا سے جدا کر دیتی تھی۔ مگر آج وہ حیرت سے گنگ تھی۔

”کیوں کرنے جا رہی ہوں؟“

اس نے آگے بڑھ کر آئینے پر اپنا ماتھا ٹکا دیا اور آئینے کے پار نظر آنے والی اپنی ہستی کی حکمران سے نظریں چار کیں۔

”کیوں کہ میں پاگل ہوں.... نفسیاتی ہوں.... سائیکو ہوں۔“

اس نے زور دار قہقہہ لگایا تھا۔

اور بچن سے نکل کر اس کے کمرے کے پاس سے گزرتی ہوئی فاطمہ ایک پل کو ٹھٹک کر رکی تھی اور تعجب سے بند دروازے کو دیکھا تھا...

”ٹھیک ہی کہتے ہیں صاب... چھوٹی مالکن پاگل ہوتی جا رہی ہیں۔“

خود کلامی کرتے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔

اور بند دروازے کے اندر آئینے کے سامنے کھڑی رانی ہنستی چلی جا رہی تھی

☆...☆...☆

بارہ جون بروز جمعرات (2013ء)

شدید گرمی میں بار بار چائے بناتے اور برتن دھوتے ہوئے میں بالکل بھول ہی چکا تھا کہ آج شام میری ایک سرپھری لڑکی سے ملاقات متوقع ہے۔ دن بھر بھانت بھانت کے لوگوں کے لیے چائے بنانا، مرتضیٰ کی کڑوی کیسلی سننا اور گندے برتن رگڑنا میرے لیے اتنا آسان نہیں تھا جتنا میں سمجھ رہا تھا۔

مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں رہا تھا۔ پسینے میں شرابور قمیص میری کمر سے تقریباً چپک چکی تھی۔ میں نے آئینہ نہیں دیکھا تھا، مگر مجھے پکا یقین تھا کہ میرا گندمی مائل سانولا رنگ اب گہرا سانولا ہو چکا ہو گا۔

لگ بھگ وہی پچھلے دن والی منحوس گھڑی ہو گی جب ایک بلیک کلر کی سیڈان چھپر ہوٹل کے کھلے ہوئے منہ کے عین سامنے کچے راستے پر آکر رکی تھی۔

مرتنضی پھٹے پر نیم دراز کسی سے فون پر باتیں کرنے میں مصروف تھا۔

چھوٹو کو اس نے تھوڑی دیر پہلے کچھ سامان لانے مارکیٹ بھیجا تھا اور میں اپنی ہی دھن میں مگن برتن رگڑے جا رہا تھا۔

ہوٹل کے اندر اور باہر کچھی کرسیوں اور بنچوں پر درجن بھر لوگ چائے پینے میں مصروف تھے جب گاڑی کا ہارن بجا۔

میں نے چائے کے دھلے ہوئے کپ ترتیب سے رکھتے ہوئے سرسری نظروں سے گاڑی کو دیکھا اور پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا جب گاڑی کا ہارن ایک بار پھر بج اٹھا۔

مرتنضی نے بات کرتے کرتے رک کر گاڑی کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف منہ کر کے آواز لگائی۔

”اوے بھائو پرویز..... کار والے سے آرڈر لے کب کا ہارن بجا رہا ہے۔“

میں نے برتن وہیں چھوڑے اور قمیص کے دامن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے گاڑی کی طرف چل پڑا۔ میں ابھی گاڑی سے چند فٹ دور ہی تھا جب گاڑی کا دروازہ کھلا اور سیاہ چشمہ آنکھوں پر سجائے، کاٹن کا گلابی دوپٹا گلے میں ڈالے، کمر تک آتے کھلے بالوں والی ددھیارنگ لڑکی سادہ مگر دلکش سے دکھنے والے کپڑوں میں ملبوس گاڑی سے باہر نکلی۔

مجھ سمیت وہاں بیٹھ کر چائے پیتے درجن بھر لوگوں کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

مرتنضی بات کرتے کرتے ایک بار پھر رُک گیا تھا اور راستے سے گزرنے والوں کے قدم سست پڑ چکے تھے۔ گھڑی بھر کے لیے وقت رُک سا گیا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان اب بھی جیسے یاسات فٹ کا فاصلہ تھا۔

اس نے دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی سے مجھے اشارہ کر کے اپنے قریب بلایا تھا۔ میں ٹرانس کی سی کیفیت میں کھینچتا ہوا اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ گاڑی کے ادھ کھلے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ میرے قریب آتے ہی اس نے اپنا قیمتی سیاہ چشمہ اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

تب میں نے اور میرے آس پاس بت بنے لوگوں نے اس کی بڑی بڑی کالی سیاہ آنکھوں کو دیکھا تھا، مگر ان آنکھوں پر پہرا دیتی لانی پلکیں صرف میں ہی دیکھ سکتا تھا کیوں کہ اس وقت اس کے اتنا قریب صرف میں ہی تھا۔

”میں آگئی ہوں۔“ اس نے اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر ہولے سے کہا تھا۔
یہ آواز..... مجھے گزری رات کے وہ پانچ منٹ جھٹ سے یاد آ گئے تھے۔ میرا تنفس حد سے زیادہ تیز ہو چکا تھا۔ اس کی خوبصورتی کا معترف تو میں اس کے مبہم سراپے کو دیکھ کر ہی ہو گیا تھا۔ اتنی دلکش لڑکی ہوگی اس کا اندازہ مجھے ہر گز نہیں تھا۔ میری حالت خراب ہونے لگی۔ اس لڑکی کو میں رات کھری کھری سنا کر آیا تھا۔ میں نے چشم تصور میں خود کو اور اسے ایک ساتھ کھڑے دیکھا تھا۔
میں تو اس سے بات کرنے کے لائق بھی نہیں تھا۔ کجا کہ اس کے منہ پر اس کے باپ کو برا بھلا کہنا۔

”تم نے جو کرنا ہے کر سکتے ہو، بس پایا کو معاف کر دو۔“

اس نے دھیمی آواز میں بہ غور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
ارد گرد کے تمام لوگ ہم دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے، کسی کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ پسینے میں شرابور چھیر ہوٹل کے لڑکے کو بلیک سیڈان سے نکلنے والی دو شیزہ کیا کہہ رہی ہوگی۔

”آرڈر لے لیا ہے تو آجا اب۔ کیا چائے کا بول رہی ہے میم صاب؟“

مرتضیٰ نے بے صبری سے کہا تھا۔ اس کی آواز میں بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ لڑکی کا کروفر بتا رہا تھا وہ ایسے ہوٹلوں کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی ہوگی۔
”جی چاچا....“

چائے کا بول رہی ہیں میم صاب۔“

میں نے مڑ کر مروتضیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اس کی طرف دیکھنے کے بہ جائے سر جھکا کر زمین پر دیکھتے ہوئے پست لہجے میں کہا تھا۔

”چینی کتنی لیتی ہیں آپ؟“

”جتنی تم لیتے ہو۔“

اس کے انداز رات کے مقابلے میں بدلے بدلے سے نظر آتے تھے پر میں اس کے انداز سے زیادہ اس کے طرزِ مخاطب پر حیران تھا۔

میں چپ چاپ واپس ہو لیا اور چائے بنانی شروع کر دی۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے، مجھے اب بھی یقین نہیں تھا، جو میں دیکھ رہا ہوں وہ سچ ہے یا نظر کا دھوکا؟

پانچ منٹ بعد چائے کا کپ ٹرے میں سجائے سر جھکائے میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔

اس نے کپ اٹھایا اور میں نے واپسی کے لیے مڑنا چاہا۔

”ایک منٹ“

اس کی نرم و ملائم آواز نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔
اُس نے وہیں کھڑے کھڑے چائے کی ایک چسکی لی۔ میں آس پاس کی تمام نظروں کو اس پر
مرکوز پا کر نروس تھا اور وہ ایسے کھڑی تھی جیسے اس کے اور میرے علاوہ یہاں سب اندھے
ہوں۔

”تم چائے اچھی نہیں بناتے۔ ان فیکٹ تمہیں چائے بنانا نہیں آتا۔“

پہلی ہی چسکی لیتے اُس نے بے دھڑک بتا دیا۔

”ایسے ہوٹلوں میں ایسی چائے ہی ملتی ہے۔“ میں نے سرگوشی کی۔ اس سے زیادہ آواز
ہمارے قریب بیٹھے ہوئے عادی چائے خور سن سکتے تھے۔

”کیوں؟ ایسے ہوٹلوں میں چائے دودھ اور چینی سے نہیں بنتی؟“

دوسری چسکی لیتے ہوئے اس نے جرح کی تھی۔

”میں نے آج سے پہلے کبھی چائے نہیں بنائی۔“

اس نے میری بات کے جواب میں کچھ کہنا چاہا تھا، مگر میں نے تیزی سے اسے کچھ کہنے کا
موقع دیے بغیر کہا۔

”میں کل والی بات بھول چکا ہوں.... آپ بھی بھول جائیے۔“

کچھ کہنے کے لیے کھلا ہوا اس کا منہ بند ہوا اور اس نے چائے کی تیسری چسکی لی۔

میں نے مڑنے کے لیے پر تو لے جب اس نے اچانک مرتضیٰ کی طرف دیکھ کر اونچی آواز
میں کہا۔

”انکل آپ کے ہوٹل کی چائے زبردست ہے۔ اب تو اکثر آنا پڑے گا۔“

”بوت مر بانی میم صاب‘ آپ کا اپنا ہوٹل ہے۔ جب دل کرے آؤ.... میں تابعدار ہوں۔“
مرتضیٰ صدقے واری ہونے لگا، میں نے مڑنے کے لیے قدم اٹھایا جب اس نے اسی طرح
اونچی آواز میں کہا تھا۔

”ایک منٹ‘ خالی کپ لے کر جانا۔“

میں نے پلٹ کر مرتضیٰ کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے وہیں جم کر
کھڑا رہنے کو کہا تھا۔

”معاف کرنے میں اور بھولنے میں فرق۔“

”جی میں نے معاف کیا۔ آپ جلدی سے کپ خالی کر کے جائیے یہاں سے۔“

میں نے دھیمے، مگر تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ کر کہا تھا۔ میں اس سین کو ختم کرنا چاہتا تھا۔
اس سے کچھ بعید نہیں تھا، اگلے پل میں جانے کیا کر دے۔

”تمہاری جھوٹی تعریف کی میں نے، اس لیے معاف کیا نا۔“

میں نے سر جھکایا ہوا تھا۔ اس لیے دیکھ نہیں سکتا تھا، مگر مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ یہ بات اس نے مسکرا کر کہی تھی۔

”نہیں... اس لیے کہ کل رات آپ میرے پاس آئی تھیں۔ آپ ان کی بیٹی ہو کر ان کی غلطی مان سکتی ہیں، تو اس میں بھی ان ہی کا ہاتھ ہے۔ میں رات غصے میں جانے کیا کیا کہہ گیا۔ آپ وہ سب بھول جائیے گا۔“

میں اس وقت اپنی جان چھڑانا چاہ رہا تھا۔

مگر وہ پتا نہیں کیا سوچ کر آئی تھی۔ اسے دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر میں اندر ہی اندر مشکوک سا ہو گیا۔

”اللہ جانے وہی ہے یا کسی اور کو تفریح لینے بھیج دیا اس نے۔ ان بڑے لوگوں کے ڈرامے بھی تو عجیب ہوتے ہیں۔ رات کو معافی مانگنے آگئی۔ شاید تفریح کے لیے اور اب کسی اور کو موقع فراہم کر رہی ہو گی؟“

”میں نہیں بھول سکتی۔“ اس نے اسی طرح مسکراتے لہجے میں کہا تھا۔

میں نے ہمت کر کے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ کپ خالی تھا، مگر اس نے ایسے ہی پکڑ رکھا تھا جیسے ابھی تک اس میں چائے موجود ہو۔

”کیا آپ بتا سکتی ہیں رات ہمارے درمیان کیا کیا باتیں ہوئیں تھیں؟“

میں نے اسی طرح دھیمے مگر مشکوک لہجے میں کہا تھا۔

میری بات سن کر یک بارگی اس کی آنکھوں میں حیرانی تیرنے لگی۔

”آف کورس بتا سکتی ہوں۔ میں نے تو وہ باتیں حفظ کی ہوئی ہیں اور میں یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ تم سپیدی سحر تک مجھے تاڑتے رہے تھے۔ میں نے سوچ رکھا تھا پہلے تم جاؤ گے۔ پھر میں چھت سے نیچے اتروں گی، مگر تم نے مجھے ہر ادیا... مجھے ہی جانا پڑا۔“

وہ بات ایسے کر رہی تھی جیسے ہم دونوں دیرینہ دوست ہوں۔

میں پزل بھی ہو رہا تھا، حیران بھی تھا۔ مجھے اس صورت حال کا ایک ہی حل نظر آیا تھا... خاموشی۔

”تمہاری آنکھیں کہتی ہیں تم لگاتار جاگ رہے ہو، اور یہ ماتھے پہ چوٹ کیسے لگی؟“

”گر گیا تھا۔“ میں نے مختصر اگہا تھا۔

”اوکے، تو پھر ملتے ہیں رات کو اسی بیچ پر۔“

اس نے چائے کا خالی کپ میرے ہاتھ میں پکڑ لیا اور واپس ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ دروازہ

ابھی تک کھلا تھا۔

”جی...؟“

میں نے الجھ کر اسے دیکھا تھا۔

اس نے سائیڈ والی سیٹ سے پرس اٹھایا بیس کانوٹ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے وہ مسکرائی تھی۔

یہ پہلی بار تھا جب میں نے اس کی مسکراہٹ دیکھی تھی۔ آنکھوں سے ہونٹوں تک سفر کرتی مسکراہٹ۔

”میں ٹپ نہیں دیتی۔“

اس نے کہا اور گاڑی کا دروازہ بند کر کے چشمہ آنکھوں پر لگا لیا۔

میں ایک ہاتھ میں چائے کا خالی کپ اور دوسرے ہاتھ میں بیس کانوٹ لیے ہکا بکا کھڑا اور کالے رنگ کی سیڈان کو مہران اسٹریٹ پر ٹریفک کے ہجوم میں مدغم ہوتا دیکھ رہا تھا۔

”اوئے باؤ خوش کر دیا یا تو نے تو آج تک اس ہوٹل پر ایسی کوئی میم نہیں رکی حالاں کہ یہ ایریا ایسی میموں سے بھرا پڑا ہے۔ پر تو نے آتے ہی اپنے ہوٹل کی عزت بڑھا دی۔“

مرتضیٰ میرے پاس آکر میری پیٹھ ٹھونک رہا تھا۔

”اچھا سچ بتا... کتنی ٹپ دے کر گئی؟“

اس نے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے پوچھا تھا۔

”ٹپ نہیں دیتی وہ۔“

میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تھا۔ میں ابھی تک ٹریفک کے ہجوم کو دیکھ رہا تھا۔

”کیا؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اتنی مہنگی گاڑی لیے گھوم رہی تھی۔ چائے کی تعریف بھی کر رہی تھی ’ٹپ تو لازماً دے گئی ہوگی۔ اب تو نہ بتا تو مرضی تیری... میں نے کون سا چھین لینے تھے پیسے تجھ سے۔“

مرتضیٰ تیز لہجے میں کہتے ہوئے پیچھے ہٹ کے کھڑا ہو گیا۔ اس کے لہجے میں چھپی ناراضی دیکھ کر میں نے بیس کانوٹ اس کے طرف بڑھایا۔

”یہ دے کے گئی ہے چاچا۔ پندرہ کی چائے ہے۔ بیس دے کر چلی گئی۔ پانچ روپے تم ہی رکھ لینا۔“

میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

”زیادہ تیور نہیں دکھا مجھے۔ ایک لڑکی نے تعریف کیا کر دی ’سر پر چڑھنے لگ گیا تو؟“

مرتضیٰ اپنی پرانی جون میں واپس آچکا تھا۔

میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا تھا۔ اس کی بڑبڑاہٹ اب ایک گھنٹے سے پہلے ختم نہیں ہونے والی تھی۔

میں نے چائے کا خالی کپ ٹوٹی کے نیچے رکھا اور ٹوٹی کھولتے کھولتے بند کر دی۔ کپ اٹھا کر ویسے ہی پکڑا جیسے تھوڑی دیر پہلے وہ پکڑ کے کھڑی تھی۔

”بھاجی میں دھو دوں؟“

مجھے چائے کے خالی کپ کو گھورتا پا کر چھوٹو میرے قریب آکر بولا۔

”آں..... نہیں... میں دھو دیتا ہوں۔“

میں نے چونک کر چھوٹو کو دیکھا۔ وہ سامان لے کر واپس آچکا تھا۔

اس بار ٹوٹی کھلی توکپ دھلنے کے بعد ہی بند ہوئی۔

کپ پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ میں نے بے دلی سے اٹھا کر سائیڈ پر رکھ دیا۔

”رات کے بارہ بجے پارک کے بیچ پر ملنے کا کیوں کہہ گئی ہے؟“

سوچتے سوچتے میرا دماغ دکھنے لگا تھا۔

”بھاڑ میں جائے... میں نے کون سا جانا ہے۔“

جھنجلا کر سوچا تھا میں نے اور چائے کی کیتلی اٹھا کر ٹوٹی کے نیچے پٹنی تھی۔

☆...☆...☆

بارہ جون بروز جمعرات (2013ء)

رات کے دس بج چکے تھے جب سیٹھ کریم کی گاڑی گھر میں داخل ہو کر سیدھی پورچ میں جا

کے رک گئی۔ پورچ سے باہر آتے ہی ان کی نظر گراؤنڈ فلور پر بنے ہوئے وسیع و عریض

لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز رانی پر پڑی جو ہاتھ میں ریموٹ پکڑے ٹی وی دیکھنے میں مگن

تھی۔ یہ منظر روٹین سے ہٹ کر تھا۔ وہ کبھی اپنے کمرے سے نیچے نہیں آتی تھی اور لاؤنج

میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنا تو ناممکن سی بات لگتی تھی۔ سیٹھ کریم کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل

گئی۔ وہ ہشاش بشاش موڈ میں لاؤنج میں داخل ہوئے۔ چہرے پر خوشگوار حیرت کو رانی نے

بھی محسوس کر لیا تھا، مگر بغیر کچھ کہے ٹی وی دیکھنے میں مگن رہی۔ سیٹھ کریم چند لمحوں تک

اسے ٹی وی دیکھتا ہوا تکتے رہے۔ وہ اسی طرح نیم دراز ٹی وی پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔

”ہائے کوئین... میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ لگتا ہے آج ہماری پرانی رانی لوٹ آئی ہے جو

لاؤنج میں اسی طرح بیٹھ کر بسورتی رہتی تھی۔“

وہ صوفے پر اس کے قریب بیٹھ کر ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے بولے تھے۔

”مگر میں تو نہیں بسور رہی پاپا۔ ٹی وی دیکھ رہی ہوں۔“

رانی نے ٹی وی سے نظریں ہٹائے بغیر سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

”ہاں یہ تو ہے۔ اب آپ بڑی جو ہو گئی ہیں۔ بسور نا تو آپ کو ویسے بھی نہیں چاہیے۔“

ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے اکبر کو آواز دے کر پانی کے لیے کہا تھا۔

”آپ کا لاسٹ سمیسٹر کب ختم ہو رہا ہے۔؟“

”ابھی دو ماہ ہیں پاپا۔“ وہ اب چینل بدلنے لگی تھی۔

”بیٹا آپ کی ماما فون آیا تھا۔ آج دن میں... آپ ان سے بات کیوں نہیں کرتیں؟“

”دل نہیں چاہتا پاپا۔“ چینل تیزی سے بدلتے جا رہے تھے

”یہ کیا بات ہوئی بیٹا... وہ آپ کی ماما ہیں۔“

سیٹھ کریم اس کے ایسے انداز سے ہمیشہ خائف رہتے تھے۔ وہ ذرا سا لحاظ کیے بغیر بے لچک

انداز میں بات کرتی تھی تو وہ لاجواب ہونے لگتے تھے۔

”وہ آپ سے کوئی ضروری بات بھی کرنا چاہتی ہیں۔“

”میرے ساتھ کون سی ضروری بات کرنی ہوگی ان کو پاپا۔“

اس نے چینل بدلنا ابھی تک ترک نہیں کیا تھا۔

”یہ آپ انہی سے پوچھ لیجیے گا۔ ان کا فون آیا تھا میرے پاس سو میں نے آپ کو بتا دیا۔“

سیٹھ کریم نے سائیڈ پر رکھا ہوا بریف کیس اٹھایا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیے۔ اس

سے زیادہ ضبط کرنا ان کے لیے مشکل تھا۔

رانی نے انہیں اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا اور دوبارہ ٹی وی دیکھنے میں مگن ہو گئی

تھی۔ تھوڑی دیر تک چینل بدلتے رہنے کے بعد اس نے ریموٹ صوفے پر پھینکا اور تیزی

سے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے چھت پر اپنے من پسند کونے میں جا کھڑی ہوئی۔

پیپل کے درخت کے نیچے بنے ہوئے ہوٹل کے باہر خالی بیچ اور کرسیاں پڑی تھیں۔ اس نے

غور سے دیکھتے ہوئے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی جس کے ہاتھ کی بنی ہوئی بد مزہ چائے پی

کر ابھی تک اس کا جی متلارہا تھا، مگر وہاں خالی بیچ اور کرسیاں بھی دھندلی دکھائی دیتی تھیں۔

”کل تو اس وقت آگیا تھا۔“

اس نے خود کلامی کی۔ یہ خود کلامی اسے چونکانے کے لیے کافی تھی جو اس کا احتساب کرنے

کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھی۔

”کل تو دل دکھا ہوا تھا اس کا، پتا ہی نہیں چلا ہو گا کہ کہاں جا رہا ہے کیوں جا رہا ہے؟ آج وہ

ہوش میں ہے۔ کیوں آئے گا اس طرف؟“

”کیوں کہ آج اسے میں نے بلایا ہے۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا ہو گا۔“

”تم اپنے بارے میں ضرورت سے زیادہ خوش فہم ہوتی جا رہی ہو۔“

”اور تم ضرورت سے زیادہ تلخ۔“

تلخ نہیں میں سچ کو مانتی ہوں اور سچ یہ ہے کہ تم اپنے ساتھ کھیل رہی ہو۔ ایک ایسا کھیل جو تم

خود کو ہرا کر کھیلو گی اور ہار جاؤ گی۔

”کہانا... ہار گئی تو مر جاؤ گی... تم بھی آزاد... میں بھی۔“

”مرنا چاہتی ہو۔“

”نہیں... اس کے سنگ جینا چاہتی ہوں جو رات بھر میرے لیے اس بچ پر بیٹھا رہا تھا۔“

اس نے اپنی عدالت میں دلائل دیتے ہوئے خود سے کہا اور سامنے باڑھ کے ساتھ پارک کے اندر سیمنٹ کے بنے ہوئے خالی بچ کی طرف دیکھا۔

”وہ تمہارے لیے بیٹھا تھا... یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟“

”کیوں کہ وہ رات بھر مجھے ہی دیکھتا رہا تھا۔“

”وہ تمہیں پاگل سمجھتا ہو گا۔“

”میں ہوں ہی پاگل۔“

”تم زبردستی اس کی زندگی میں گھسے چلی جا رہی ہو۔ تم خود کو ازاں کر رہی ہو۔“

”میں کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتی۔“

دور نکل پر بنے ہوئے چھپر کے باہر اب ایک چھوٹا سا بچہ اور ایک لمبے قد والا لڑکا بچ اور کرسیاں اٹھا کر چھپر کے اندر رکھ رہے تھے۔

”اس میں ایسی کیا خاص بات ہے؟“

اسے خود سے ایک اور چبھتا ہوا سوال ملا۔

”کیوں کہ وہ دوسروں کی طرح پاپا کی تعریفیں نہیں کرتا۔ مجھے حسرت سے نہیں دیکھتا، بس حیرت سے دیکھتا ہے، جو منہ میں آجائے بول دیتا ہے۔ سب سے بڑی بات ‘میں دوبار اس

کے پاس گئی۔ اس نے دونوں بار مجھے لڑکی سمجھ کر مجھ سے بات نہیں کی، اس کی آواز میں لوچ نہیں اتری۔ پہلی بار لڑتا رہا اور دوسری بار کسٹمر کی طرح میری عزت کرتا رہا۔ ایک دن مجھ سے پیار بھی کرے گا۔ ڈھیر سارا پیار۔“

اس نے بچوں کی طرح دونوں ہاتھ پھیلا کر خود کو یقین دلایا تھا۔

”پیار... پیار... پیار۔ تم کب جان پاؤ گی رانیہ کریم خان کہ تم سے کوئی پیار کرنے والا اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ تم سے تو تمہاری ماں بھی پیار نہیں کرتی۔ باپ تمہیں دو منٹ سے زیادہ برداشت نہیں کرتا اور یہ لڑکا... جو کل بارہ بجے اچانک تمہیں مل گیا۔ ایک نہ ایک دن یہ بھی بدل جائے گا۔ تمہیں استعمال کرے گا اور پھر بہانے بازیاں کر کے تم سے دور چلا جائے گا... دیکھنا تم۔“

”تم سدا کی بدگمان ہو... مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔ مجھے بس یہاں کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرنا ہے جو کل رات سے جاگا ہوا آج پھر میرے لیے جاگے گا، مجھے یہاں دیکھنے کے لیے ساری ساری رات اس بچ پر بیٹھا رہے گا اور جب میں نظر نہیں آؤں گی تو بے چین ہو جائے گا تڑپے گا اور جیسے ہی میں اس کے سامنے جاؤں گی۔ مجھے اپنی بے قراریاں سنائے گا اپنی بے اختیاریاں بتائے گا۔ تب میں بھی اسے بتاؤں گی کہ میں اس کے انتظار میں اس سے زیادہ تڑپی ہوں۔ اس سے زیادہ مچلی ہوں۔“

ہوٹل بند ہو چکا تھا۔ اس کی نظریں بار بار بھٹک رہی تھیں، مگر ابھی تک اس طرف سے کوئی بھی آتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”وہ نہیں آئے گا۔ تمہاری طرح پاگل نہیں ہے وہ۔ اسے اپنی اوقات کا پتا ہے۔“
”اوقات پتا ہوگی، تو ضرور آئے گا۔“

اس نے ہٹ دھرمی سے اس کی بات کو رد کیا جو وقت بے وقت اسے آئینہ دکھاتی رہتی تھی۔

گیارہ بجے پھر بارہ بھی بج گئے، مگر ٹکڑے ابھی تک کوئی پیدل چلنے والا دکھائی نہیں دیا تھا۔ راستہ سنسان پڑا تھا۔ مہران اسٹریٹ پر بھی ٹریفک اب اکا دکا گاڑیوں تک رہ گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ پہ جم کے کھڑی تھی۔

”وہ اب تک سوچکا ہو گا۔ تم بھی جا کر سو جاؤ۔“
”نہیں... میں اس سے ملے بغیر نہیں سو سکتی۔“

”کب تک کھڑی رہو گی؟“

”جب تک وہ آ نہیں جاتا۔“

”وہ نہیں آئے گا۔“

”تو میں چلی جاؤں گی۔“

”کیا؟... تم اس وقت اس کے پاس جاؤ گی؟“
”ہاں۔“

”پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں جاگرو گی؟ کیا عزت رہ جائے گی اس کی نظر میں تمہاری۔“

”تو پھر میں کیا کروں؟“

بے بسی کے احساس سے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔

”سچ کو تسلیم کر لو اور اسے بھول جاؤ... اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔“
”مجھے اپنی بھلائی عزیز نہیں۔“

”اور عزت؟“

وہ خاموش ہو گئی تھی۔

”عزت سے بڑی اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اپنی عزت کی خاطر ہی اسے بھولنے کی کوشش کرو۔“

”نہیں کر سکتی۔ میں نے پہلی بار کسی کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔“

وہ بار بار سر جھٹک رہی تھی۔ پاؤں پٹخ رہی تھی۔ آنسو بہا رہی تھی۔ راستہ ویسے کا ویسا سنسان پڑا تھا۔ ایک بجنے کو تھا اور امید مرنے لگی تھی، مگر وہ اسے مرنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ بڑی

مشکلوں سے پہلی بار اپنے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہوئی تھی اب ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے اٹنے ہاتھ سے آنسو صاف کیے۔

”میں ساری رات یہاں کھڑی رہوں گی۔ جب تک تم نظر نہیں آؤ گے یہاں سے نہیں ہلوں گی۔“

اس نے دل ہی دل میں اسے مخاطب کر کے اپنے مصمم ارادے بتائے تھے۔

رات سرکتی جا رہی تھی اور اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔ کوئی ذرا سے فاصلے پر بلکتی ہوئی لڑکی سے انجان بے خبر سو رہا تھا۔ وہ کوئی... کوئی بھی ہو سکتا تھا۔

اس کا باپ۔ اس کے گھر کے نوکر۔

یا دور دراز سے آیا ہوا بانس کی طرح لمبا اور سانولا سا لڑکا جسے قسمت اس کے قریب لے آئی تھی۔

ماں تو اس کی پہنچ سے بہت دور تھی۔ اتنی دور جہاں اس کے رونے کی آواز قیامت تک بھی نہ پہنچ سکے۔

☆...☆...☆

تیرہ جون بروز جمعہ (2013ء)

صبح چھ بجے کا وقت تھا جب میرے کانوں میں مرتضیٰ کی کرخت آواز گونجی۔

”اٹھ جاؤ... چھوٹو کے ساتھ لگ کے کرسیاں ٹیبل باہر نکال۔“

میں نے نیم غنودگی میں سر اٹھا کر سامنے کھڑے مرتضیٰ کو دیکھا، وہ اپنی توند کھجاتے ہوئے مجھے پاؤں کی ٹھوک سے جگا رہا تھا۔

”جی چاچا۔“

میں نے لمبی سی جمائی لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چھوٹو اکیلا بیچ گھسیٹتے ہوئے باہر نکال رہا تھا۔ مرتضیٰ مجھے گہری نیند سے اٹھانے کے بعد اب منہ ہاتھ دھونے نلکے کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اٹھ کر بستر کے نام پر زمین پر بچھی ایک میلی کچیلی چادر کے اندر تکیہ لیٹا اور چھوٹو کے

کپڑوں کے ساتھ پڑے اپنے بیگ کے اوپر رکھ دیا۔ پہلی بار زمین پر سویا تھا۔ کمر بری طرح دکھ رہی تھی۔ دو تین زور دار انگڑائیاں لے کر میں نے اپنے جسم کی تمام ہڈیوں کا جائزہ لیا۔

میرا دماغ اس وقت بالکل خالی تھا۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد میں نے چھوٹو کے ساتھ مل کر

اس کٹیا کو ہوٹل کی شکل دی۔ سات بجے تک اکا دکا لوگ آنا شروع ہو جاتے تھے۔ آج جمعہ تھا مرتضیٰ کا حلیہ دیکھ کر لگ رہا تھا اسے دوسری نمازوں کے علاوہ نماز جمعہ سے بھی کوئی خاص

دلچسپی نہیں تھی۔

”چاچا میں آج حمام پر جاؤں گا۔ مجھے کپڑے بدل کر جمعہ کی نماز ادا کرنی ہے۔“
”میں بھی جاؤں گا۔“

چھوٹو میری بات سن کر جلدی سے بولا تھا۔

”کوئی ضرورت نہیں تو نماز یاد تو کر لے پہلے۔ اچھا بتا جمعہ کی نماز کی کتنی رکعتیں ہوتی ہیں؟“
مر تفضی! اجڈ لوگوں کی طرح آنکھیں نکال کر سوال کر رہا تھا۔

چھوٹو اٹک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

”تو اس میں اس کا کیا قصور ہے چاچا۔ اسے کوئی یاد کروانا تو کرتا۔ چلو آج میرے ساتھ جائے گا تو کم از کم رکعتیں سیکھ ہی لے گا۔“

میں نے چھوٹو کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا مگر مرتضیٰ کی اگلی بات نے میری مسکراہٹ پل بھر میں غائب کر دی۔

”یہ تین دن پہلے ہو آیا ہے حمام سے۔ پتا بھی ہے کتنا خرچہ ہوتا ہے ایک بار حمام جانے سے؟ تم چلے جاؤ اکیلے۔ مسجد جاتے وقت اسے ساتھ لے جانا۔“

میں نے دانت پر دانت جما لیے تھے۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ یہ حد سے زیادہ کمینہ ہے یا کنجوس؟

”جمعہ کے دن نہانا ثواب ہوتا ہے چاچا اور نہا کے جمعہ کی نماز خوش قسمت لوگ ادا کرتے ہیں۔ یہ میرے ساتھ جا رہا ہے۔ اس کا آج کا خرچ تم میرے کھاتے میں لکھ دینا۔“

میں نے طنز آگاہا تھا مگر وہ شرمندہ ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے باؤ۔ تیرے خرچے پر روز جائے حمام۔ مجھے کیا تکلیف ہونی ہے۔ اب جلدی کرو واپس آ کے کام بھی دیکھنا ہے۔“

”حمام کس طرف ہے چاچا؟“

”چھوٹو کو پتا ہے۔ لے جائے گا تجھے۔“

اس نے منہ بنا تے ہوئے کہا تھا۔

میں نے چھوٹو کو اشارہ کیا۔ اس نے اپنا اور میرا ایک ایک صاف جوڑا لیا اور چھپر سے باہر نکل کر آیا۔

”بھاجی پارک سے تھوڑا آگے چوک ہے۔ وہاں سے دائیں طرف مڑ کر ہم حمام والی گلی میں داخل ہو جائیں گے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور چھوٹو کے ساتھ ہو لیا۔ ہوٹل سے بیس پچیس قدم آگے نکلتے ہی ہم دائیں طرف بنی ہوئی کوٹھیوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ میرے نظروں کے سامنے کریم پیلس کا وہی بورڈ گھوم گیا جسے میں نے پارک کے بالکل سامنے چمکتے ہوئے دیکھا

تھا۔ اس خیال کے آتے ہی مجھے گزشتہ شام کا وہ واقعہ بھی یاد آگیا۔ میں نے بے اختیار نظریں اٹھا کر دور ہی سے اس کونے کو دیکھا جہاں وہ اس رات کھڑی نظر آتی رہی تھی۔ وہاں اب بھی کوئی کھڑا تھا۔ دور سے بس سایہ سالگتا تھا، مگر مجھے قوی یقین ہو چلا تھا کہ یہ وہی ہوگی۔ میرے اور چھوٹو کے قدم دھیرے دھیرے پارک کے قریب آتے جا رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی وسیع و عریض کریم پیلس بھی واضح ہوتا جا رہا تھا۔ چند قدم اور چلنے کے بعد میرا یقین اور بھی پختہ ہو چکا تھا۔ چھت کے چاروں طرف تقریباً چار فٹ اونچا لوہے کا بڑا ہی پیارا سا جنگلا لگا ہوا تھا جو کوٹھی کی خوبصورتی میں اور بھی اضافہ کرتا تھا اور وہ پری چہرہ مہران اسٹریٹ والی سائیڈ پر کونے سے لگ کر کھڑی اسی طرف دیکھ رہی تھی جدھر سے میں اور چھوٹو آرہے تھے۔

”اوکے... تو پھر ملتے ہیں رات کو اسی بیچ پر۔“

اس کا کہا ہوا یہ جملہ اس وقت میرے کانوں میں گونجا جب میں کریم پیلس کے مین گیٹ اور مرتضیٰ کے چھپر ہوٹل کے درمیان پہنچ چکا تھا۔

میرے قدم رک گئے۔ چھوٹو نے چار قدم آگے بڑھ جانے کے بعد مجھے اٹکا ہوا محسوس کیا تھا۔

”کیا ہوا بھاجی؟ آپ رک کیوں گئے؟“

اس نے پیچھے مڑ کر مجھ سے پوچھا۔

”چھوٹو کوئی اور حمام نہیں ہے۔ اپنے ہوٹل کے قریب مین روڈ کے آس پاس؟“

چھوٹو نے حیرت سے مجھے دیکھا تھا۔

”بھاجی ہوٹل کے پچھواڑے بس مین روڈ ہی ہے۔ روڈ کے پار گاڑیاں ٹھیک کرنے والے اور پنچر لگانے والوں کی دکانیں ہیں۔ ان سے آگے مہران چورنگی ہے۔ وہاں جا کر بھی حمام ملنے والا نہیں ہے۔ ہمارے قریب مہران ٹاؤن ہی ہے، یہیں پر جانا پڑے گا مگر بھاجی مسئلہ کیا ہے... اتنا دور تو نہیں ہے۔؟“

میں اسے نہیں بتا سکتا تھا کہ مسئلہ کیا ہے۔ میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ کل شام کے واقعے کے بعد میں اندر ہی اندر اس سے خائف ہو گیا تھا۔ کچھ ہمارے درمیان طبقاتی فرق جو بلاشبہ زمین اور آسمان کے فرق جتنا تھا اور کچھ اس کی نا سمجھ میں آنے والی حرکتیں اور باتیں تھیں۔ میں اجنبی شہر میں آتے ہی خود کو الجھاؤ میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس کا اپنے باپ کی جگہ معافی مانگ لینا اپنی جگہ اور وہ اس کا بڑا پن تھا جسے میں نے تسلیم بھی کیا تھا مگر کل شام کی باتیں سننے کے بعد مجھے وہ نارمل بالکل بھی نہیں لگی تھی اور مجھے اس وقت بھی یہی خدشہ تھا کہ مجھے پہچانتے ہی وہ آوازیں لگانا شروع نہ کر دے۔

”آ جاؤ بھاجی... یہ تو ہے سامنے چوک۔“

چھوٹو نے مجھے ساکت کھڑے دیکھ کر کہا تھا۔ میں چار ونا چار اس کے ساتھ آگے بڑھنے لگا تھا۔

کریم پیلس کا وہ گیٹ قریب آتا جا رہا تھا اور ساتھ ہی وہ بھی واضح ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے ایک بار ترچھی نظروں سے اسے دیکھا تھا، وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ صبح کے سات بجے راستے پر پیدل اور سائیکل والوں کے ساتھ ساتھ کوئی کوئی موٹر بائیک والا بھی گزر رہا تھا۔ میں نے چند فٹ کے فاصلے پر لگے ہوئے کریم پیلس کے بورڈ کو دیکھا اور پھر چھت کی طرف۔

اب وہ وہاں نہیں تھی۔ بہ ظاہر یہ نارمل تھا مگر مجھے عجیب سی بے چینی لاحق ہونے لگی تھی۔ ”چھوٹو جلدی چلو۔ واپس بھی جانا ہے۔“

میں نے تیز تیز قدم اٹھانے شروع کر دیے تھے اور پیچھے رہ جانے والے چھوٹو کو بھی تیز چلنے کا کہہ رہا تھا۔ میں ایسا کیوں کر رہا تھا؟ یہ نہیں جانتا تھا مگر میری چھٹی حس بار بار الارم بج رہی تھی۔ میں کریم پیلس کر اس کرتے ہوئے دس قدم بھی نہیں چل پایا تھا جب گیٹ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر چھوٹو کو جلدی کرنے کو کہا تھا۔

”مگر چھوٹو تو کریم پیلس کے عین سامنے ہی رک چکا تھا۔ اس نے اسے روک لیا تھا۔“
چھوٹو کو دیکھنے کے لیے میں پیچھے مڑا، تو وہ اس کا ہاتھ تھامے ہوئے چلتے ہوئے میری ہی طرف آرہی تھی۔

میں نے اس کی لال سرخ آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو دیکھ لیے تھے۔ دوپٹے سے بے نیاز قمیص شلوار میں ملبوس سراپا اس کی دل کشی کا آئینہ دار تھا۔ کھلے ہوئے بے ترتیب بال اور ننگے پاؤں بتاتے تھے کہ وہ بہت عجلت میں بھاگتی ہوئی آئی ہے۔ ڈبڈباتی سرخ آنکھیں اور ان آنکھوں میں درج شکایت اس کے ضبط کی کڑی مسافت سے گزرنے کا پتا دے رہیں تھیں اور اس کا لیچ چہرہ جو اس وقت سُتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اس کے رت جگے کا حال بتا رہا تھا۔

میں حیران اور پریشان اسے قریب سے قریب تر آتا دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے قریب بہت ہی قریب آگئی۔ چھوٹو اپنا ہاتھ چھڑوا کر اب حیرت سے بت بنا ہم دونوں کے بیچ کھڑا ہماری شکلیں دیکھ رہا تھا۔ ”میری آنکھیں دیکھ رہے ہو؟“

گھمبیر لہجہ... آنکھوں کے تاثر سے بالکل الگ، مجھے اپنی زبان تالو سے چپکی ہوئی محسوس ہوئی۔ ”یہ آنکھیں دیکھ سکتی ہیں یہ میں نے پرسوں رات جانا۔ بینائی پا کر بھی نابینا لوگوں جیسی زندگی گزار رہی تھی میں۔ لوگ آنکھوں پر پہرے بٹھاتے ہیں۔ میری آنکھیں میرے دل کا پہرہ دیتی تھیں۔ دل محسوس کرتا تھا، آنکھیں اندھی ہو جاتی تھیں۔ دل بجھ جاتا تھا، بے بس ہو جاتا تھا... میں نابینا تھی۔ تب بھی جاگتی تھی۔ اذیت ہوتی تھی۔ آج رات پہلی بار بینائی

کے احساس کے ساتھ جاگی ہوں۔ اذیت ہوئی... ہاں مجھے اذیت ہوئی 'میٹھی سی اذیت۔
میٹھی اذیت کیا ہوتی ہے جانتے ہو؟

اس نے اک پل کا توقف کیا اور منہ بند کر کے لمبی سانس کھینچی تھی۔ آنکھیں بھی بند کر لیں۔ کاش میں بھی کر سکتا۔ میں نہیں کر سکا تھا۔ اس نے لمبی سانس چھوڑی۔ میں نے اس کے تنفس کو پوری طرح اپنے چہرے کے اوپر محسوس کیا تھا۔ اس کی آنکھیں کچھ لمحوں تک بند رہیں اور میری بے اختیار۔

پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ڈبڈباتی ہوئی سرخ آنکھیں۔ دو موٹے موٹے آنسو پلکوں کی باڑھ توڑ کر اس کے گالوں پر لکیر کھینچتے ہوئے ٹھوڑی کے نیچے غائب ہو گئے تھے۔

میں منجمد تھا برف بن چکا تھا۔ جون کے مہینے میں صبح کے سات بجے کراچی کا موسم اتنا ٹھنڈا نہیں ہوتا، مگر ان چند گھڑیوں نے میرے تمام عضلات کو سن کر دیا تھا۔

”آنسو کمزور بنا دیتے ہیں نا۔ لہجوں کو، رویوں کو، مگر میرے آنسو مجھے کمزور نہیں بناتے اور بھی مضبوط کر دیتے ہیں۔ میرے آنسو مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں تم ہمیں ہمیشہ تنہائی میں کیوں بلاتی ہو؟ لو... آج تمہارے سامنے بلا لیا۔ شکایت دور کر دی ان کی۔ اب یہ مجھ سے پوچھیں گے۔ تمہارے سامنے ہی کیوں؟ میں کہوں گی تم وہ ہو جس نے مجھے بینائی کا

احساس بخشا اور میٹھی اذیت سے روشناس کروایا۔ تمہارا شکر یہ اجنبی۔ میں اس میٹھی اذیت کو مرتے دم تک سنبھال کے رکھوں گی۔ چاہے تم اسے بانٹنے آؤ یا نہ آؤ۔

میں نے اپنے باپ کی موت پر چند عورتوں کو ماں کے ساتھ مل کر روتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کے آنسو سچے تھے یا جھوٹ، میں نہیں جانتا تھا۔ اپنی ماں کے آنسو بھی کئی بار دیکھے تھے میں نے۔ صرف دکھ کا احساس دلو سکتے تھے، ان میں کتنی سچائی ہوگی، کتنی گہرائی ہوگی۔ میں نے کبھی جاننا ہی نہیں چاہا تھا۔ میں آنسوؤں کی زبان سے انجان تھا۔ میرے نزدیک آنسو دکھ کی علامت تھے۔ نہیں... میں غلط تھا، آنسو تو خوشی کی علامت بھی کہلاتے ہیں اور آج جانا تھا۔ کچھ آنسو آپ کے اپنوں کے نہیں ہوتے۔ آپ کے بھی نہیں ہوتے، کسی اجنبی کے ہوتے ہیں۔ جیسے اس انجان لڑکی کے تھے جس کے نام تک سے آشنائی حاصل نہ تھی مجھے اور جیسے وہ انجان تھی مجھ سے۔ پر یہ آنسو مجھے بتا رہے تھے یہ لڑکی سو فیصد سچ کہہ رہی ہے جسے تم دل ہی دل میں سکی سمجھتے ہو۔ ہمیں آج تک تمہارے علاوہ کسی نے نہیں دیکھا۔ یہ اپنی بات میرے دل تک پہنچا رہے تھے، مجھے قائل کر رہے تھے اور آج اس پل ایک انوکھا احساس جاگ رہا تھا۔ کوئی ہے جس کے آنسو میرے علاوہ کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ یہ سوچ احساس بن کر میرے پورے جسم میں پھیل رہی تھی۔ میں اس پل کے رک جانے کی دعا کر رہا تھا۔ پر یہ پل کہاں رکتے ہیں؟ پھسلتے جاتے ہیں 'میٹھی میں دبی ہوئی خشک ریت کی طرح۔ یہ پل بھی

پھسل چکا تھا اور اگلے پل میں حقیقت اپنا پھن پھیلائے میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں 'پرویز گل اور میرے سامنے آنسو بہا کر مجھے اس دنیا میں سب سے الگ رتبہ دینے والی انجان لڑکی جو میرے طفیل اپنی بینائی لوٹنے کا جشن آنسوؤں سے منا رہی تھی۔ ایک ہی دنیا میں رہ کر بھی الگ الگ دنیا بنانے پر مجبور تھے۔ میری دنیا میرے کچے گھر میں تنہا بیٹھی میری ماں سے شروع ہو کر مرتضیٰ کے جھونپڑے پر ختم ہو جاتی تھی اور وہ میرے سامنے پہاڑ کی طرح استادہ خوبصورت محل میں رہنے والی خوبصورت شہزادی تھی۔ شہزادیوں اور غریب لکڑہاروں کی بے شمار کہانیاں میں نے ماں سے سن رکھی تھیں ' مگر یہ کہانی نہیں حقیقت تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹی۔

”میں ہر پل اس اذیت کی حفاظت کروں گی جو تم مجھے تحفے میں دے کر جا رہے ہو۔“ وہ مڑ کر کریم پیلس کے اندر چلی گئی اور میں خالی خالی نظروں سے کریم پیلس کے گیٹ کو دیکھنے لگا۔

کچھ پل اور گزر گئے۔ تب مجھے چھوٹو کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی سنائی دی جو میرے پاس کھڑا میرا ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے بلارہا تھا۔

”میں نے چھوٹو کی طرف دیکھا، پتا نہیں کیا دیکھ لیا ہو گا ان آنکھوں میں اس نے بدک کر پیچھے ہٹ گیا۔

”بھاجی کیا ہوا وہ لڑکی کون تھی؟ اور آپ رو کیوں رہے ہو۔“

”کیا؟ میں رو رہا ہوں؟“

میں نے سوچتے ہوئے بے اختیار اپنا دایاں ہاتھ اپنی گال پر رکھا۔ بھیگا ہوا گال۔

”میں کیوں رو رہا ہوں؟“

میں حیرت زدہ تھا۔ اپنے خاموش آنسوؤں پر جو بناتائے بلا وجہ ہی آگئے تھے۔

آنسو بلا وجہ بھی آسکتے ہیں؟ کیسے آسکتے ہیں؟ آج تک تو نہیں آئے۔ باپ کے مرنے پر آئے تھے، ماں کو گھر میں چھوڑ کر شہر جاتے ہوئے آئے تھے اور تھپڑ کھا کر ذلیل ہوتے ہوئے آئے تھے۔ پر آج، آج کیوں؟ ابھی اس وقت کیوں؟

ایک بوڑھے نے سائیکل میرے پاس آکر روکی اور پوچھنے لگا۔

”کیا ہوا بیٹے؟ کیوں رو رہے ہو؟“

میں نے چونک کر بوڑھے بابا کی طرف دیکھا اور اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”پتا نہیں بابا۔“

”رولوبیٹا رونے سے بوجھ ہلکا ہوتا ہے، مگر یہاں بیچ راستے میں نہیں گھر جا کے رو۔ اپنے پیاروں کے پاس جا کر رولو۔“

بابا سائیکل چلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

”گھر... پیارے... دونوں سے محروم تھا میں آج کے دن۔ کبھی کبھی محرومیاں ستاتی ہیں، اپنی پوری طاقت سے۔ ہمیں بتاتی ہیں کہ ہم کس قدر محروم ہیں، کس قدر بے بس اور لاچار ہیں۔ میں شکستہ قدموں سے چپ چاپ چھوٹو کے پیچھے چلتا رہا تھا۔ کب پہنچا، کب واپس آیا، کب کام شروع کیا اور کب نماز جمعہ کا وقت ہوا مجھے پتا ہی نہیں چلا۔

جب مرتضیٰ نے کہا تھا ”اذانیں شروع ہو گئی ہیں باؤ۔ چل پڑھ لے جمعہ کی نماز اور چھوٹو کو بھی لے جا۔“

وہ اپنے تئیں احسان کر رہا تھا۔ میں نے اسے حیران و پریشان کر دیا۔

”آج جمعہ ہے؟“

”کیا کہا...؟ اے باؤ پاگل واگل ہو گیا کیا؟ آج صبح تو گیا تھا، تو چھوٹو کے ساتھ جمعہ کی نماز کی تیاری کرنے اور اب بھول بھی گیا؟“

میں اسے جواب دیے بغیر جمعہ کی نماز کے لیے چل پڑا تھا۔

”اس طرف نہیں بھاجی۔“

مجھے اپنے پیچھے چھوٹو کی آواز سنائی دی جو مجھے کریم پیلس کی طرف جانے والے راستے سے منع کر رہا تھا۔

میں ایک بار پھر اس کے پیچھے ہو لیا۔

”مسجد تو اس طرف بھی تھی اور نزدیک بھی پڑتی تھی، لیکن میں نے سوچا ہم آج اس طرف کوئی مسجد ڈھونڈتے ہیں۔“

چھوٹو نے ہوٹل کے پچھوڑے گزرنے والی مہران اسٹریٹ کی طرف جاتے ہوئے کہا تھا۔ میں نے اسے کچھ بھی نہیں کہا۔

ہم دیر تک چلتے رہے۔ مہران اسٹریٹ آگے جا کر مہران چوک پر ختم ہو گئی۔ چوک کی چاروں طرف دیکھتے ہوئے چھوٹو کو ایک مسجد نظر آگئی اور میں اسے لے کر مسجد پہنچ گیا۔

نماز ادا کرتے ہوئے بار بار ڈبڈباتی آنکھوں والا چہرہ میرے سامنے آ جاتا۔ میں نے دل سے

نماز ادا کرنی چاہی تھی، مگر آج اس سے ملنے کے بعد میں کوئی بھی کام دل سے کر نہیں پایا

تھا۔ نماز کے بعد میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور جھٹ سے میرے ہاتھ کے پیالے میں

پھر اسی کا چہرہ ابھر آیا۔

”یا اللہ...“

میں نے دل کی گہرائیوں سے اللہ کو پکار کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایسا ہوتا ہے، جب ہم خود کو بالکل بے بس سمجھتے ہیں اور خود پر اختیار کھونے لگ جاتے ہیں۔ تب وہی ایک ہستی نظر آتی ہے جو ہمارے حال پر رحم کر سکتی ہے۔ مگر میری پکار میں صداقت کی کمی تھی یا نیت میں کھوٹ تھا۔ میری دعا کو شرف قبولیت عطا نہ ہوئی، مسجد سے باہر آ کر بھی میرا من بار بار ایک ہی چہرے میں ڈوب کر اُبھر رہا تھا۔ آنکھوں نے اس منظر کو ایسا نقش کیا تھا کہ اب کوئی اور نظارہ ان کے لیے قابل قبول نہ تھا، میں اندر ہی اندر جلنے لگا تھا۔

”یہ کیسی اذیت ہے؟“

واپس آتے ہوئے میں نے سوچا تھا۔

”اذیت کیا کہہ رہی تھی وہ۔ میٹھی اذیت جو میں نے اسے تحفے میں دی تھی اور اس نے آج مجھے کیا دے دیا تھا۔ یہ کیسا احساس تھا؟ کیا یہی وہ میٹھی اذیت ہے؟ کیا یہی مجھے لوٹانے آئی تھی وہ؟“

چھپر ہوٹل کی طرف مڑتے ہوئے ایک گاڑی نے ہارن دے کر مجھ سے راستہ مانگا۔

”میں نے ایک سائیڈ پر ہو کر مڑتے ہوئے غائب دماغی سے گاڑی میں بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا۔

اور ایک زوردار جھٹکے سے ہوش میں آ گیا۔

مجھے تھپڑ مارنے والا اس کا باپ کینہ پرور نظروں سے مجھے گھورنے کے بعد کچھ بڑبڑا رہا تھا گالیاں دے رہا تھا۔

اور پھر ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے آگے بڑھ چکا تھا۔

ایک اور سوچ، ایک اور سوال میرے سامنے کھڑا تھا۔

”کیا وہ اس شخص سے بھی اپنے آنسو چھپا کے رکھتی ہے؟“

☆...☆...☆

تیرہ جون بروز جمعہ (2013ء)

وحشت ہجر غم یار سے ڈر لگتا ہے عشق سچا ہو تو دلدار سے ڈر لگتا ہے

ٹوٹ جائے نہ بھرم میرے صنم خانے کا دل کے اجرے ہوئے مہ خوار سے ڈر لگتا ہے

یہ تو ممکن ہی نہیں درد محبت نہ ملے چرچاء حسن پہ گفتار سے ڈر لگتا ہے

یہ تو ممکن ہی نہیں درد محبت نہ ملے چرچاء حسن پہ گفتار سے ڈر لگتا ہے

ایک نظر جس کی میری سانس چرالیتی ہے ایسے جذبوں کے خریدار سے ڈر لگتا ہے

زندگی فخر جوانی میں گزاری شبنم اب مجھے وقت کی رفتار سے ڈر لگتا ہے

وہ بستر پر لیٹی کسی شاعر کی غزل بڑے ترنم سے گنگنا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور دل ہولے ہولے اس کے منہ سے نکلتے لفظوں کی لے پر دھڑک رہا تھا۔ آج پہلی بار وہ ہار کر آ رہی تھی۔ بے مول ہو کر آ رہی تھی۔ پہلی بار کچھ مانگ رہی تھی کچھ دان کر رہی تھی۔ اپنی آنکھوں کے دو قیمتی موتی کسی پر نچھاور کر آئی تھی وہ اور اب کمرے کے خنک ماحول میں لیٹ کر گزرے پلوں کے حصار میں رہ کر سوچنا چاہتی تھی۔

”کیا سوچتا ہو گا وہ میرے بارے میں؟“

اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ جو اسے کھ پتلی کی طرح نچا کر خوش ہوتی تھی۔ آج چپ تھی جیسے مر گئی ہو یا اپنی شکست تسلیم کر لی ہو۔ وہ اس انگڑائی کو نہیں دبا سکی تھی جو اس کی باندی نے اچانک ہی لے کر اس کی پہنائی ہوئی ساری زنجیریں توڑ ڈالیں تھیں ایک ہی جھٹکے میں نہیں شاید وقفے وقفے سے۔

”بتاؤ نا کیا سوچتا ہو گا؟“

رانی کو اس کی چپ بری طرح کھل گئی۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی، آج پہلی بار میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے انوکھے رنگ دیکھے ہیں۔ کسی کی آنکھوں میں اپنے لیے شدت دیکھی ہے، اپنی بے مول ذات کے لیے کسی کو ترستے دیکھا ہے مگر آج اسے خود سے جواب نہیں مل رہا تھا۔ اس کے اندر کوئی خاموش بیٹھا تھا، جیسے تماشا دیکھنے کا متمنی ہو یا تھک گیا ہو۔

”تم نہیں بتا سکتیں۔ تم حیرت زدہ ہو کوئی مجھے بھی پیار کر سکتا ہے؟ مجھے رانیہ کریم خان کو اپنی زندگی مان سکتا ہے؟ تم آج نہیں بول پاؤ گی۔ میں تمہیں سننا چاہتی ہوں۔ بولو جواب دو۔ کہہ دو کہ آج اس کی آنکھوں میں چھپے رنگ دیکھ کر تمہیں احساس ہوا کہ تم غلط ہو۔ کوئی مجھے بھی چاہ سکتا ہے، میری خوشی کا احساس کر سکتا ہے۔ کچھ بولو یا کہہ دو کہ جو آج میں دیکھ کر آئی ہوں وہ بھی جھوٹ ہے؟ فریب ہے؟ نظر کا دھوکا ہے؟.... بولو؟“

کوئی نہیں بول رہا تھا، جیسے بولنے کے لیے کچھ باقی نہ ہو اس کے پاس، لفظ ختم ہو گئے ہوں۔ ”تم اس طرح منہ چھپا کر نہیں بیٹھ سکتیں۔ تم میری جواب دہ ہو۔ ہاں آج تم میری جواب دہ ہو؟“

وہ بیڈ سے اٹھ کر قد آدم آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور دوسری طرف نظر آنے والی اپنی پر چھائی کو غصے سے گھورنے لگی۔

”کہہ دو کہ آج بھی غلط کر آئی ہوں میں۔ اس سے بھیک مانگ کر اپنا سودا ستے داموں میں کر آئی ہوں، بے قیمت ہو کر واپس آئی ہوں۔ اس کی خاموشی میں میرے لیے کچھ بھی نہیں چھپا تھا۔ وہ بس حیرت زدہ تھا۔ آج بھی مجھے پاگل سمجھ رہا تھا۔ کہہ دو کہ آج بھی میں زبردستی اس کے راستے میں آئی ہوں۔ وہ تو بھاگ رہا تھا، چوری چوری مجھے دیکھتے ہوئے تیز چلنے لگا تھا۔ بے خبر کہ میں کل رات اس کی خاطر جاگی ہوں۔ پل پل تڑپی ہوں مگر وہ میری تڑپ

میری بے قراری، میری بے بسی کو عجوبے کی طرح دیکھ رہا تھا۔ کہہ دو وہ اب اس طرف کبھی نہیں آئے گا کہ وہ اور بھی خائف ہو گیا ہے، کہہ دو کہ اس نے مجھے کسی آس یا امید کا کوئی سرا نہیں تھمایا اور مجھے اس کی غم آنکھوں میں اپنے لیے ہمدردی نظر آرہی تھی۔ وہ ہمدردی جسے میں پیار کی قندیل سمجھ کر اپنی اندھیر زندگی میں روشنی بھرنے جارہی تھی۔ کہہ دو نا.....

ہونٹ پہنچ کر آنسو بہاتی ہوئی وہ پرچھائی کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ کچھ دیر چپ رہی۔ پھر اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ رانی آنسو بھول کر اس کے قہقہے کو دیکھ رہی تھی۔

”جو مجھے کہنا تھا، وہ تم نے خود ہی کہہ دیا، میں تو صرف تمہاری سوچ ہوں، تمہاری پرچھائی، جو سچ سے واقف ہے، تم مجھے دھوکا دے کر راہ فرار چاہتی ہو تو جاؤ بھاگ کر دیکھ لو۔ میں ہر دم تمہارے ساتھ رہوں گی، تمہاری ذلت کا تماشا دیکھنے کے لیے دنیا تو ہوگی، مگر میرا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ جب تم مجھ سے منہ چھپانے کے لیے قبر کا رستہ چنو، میں تمہارے قبر میں اترنے تک تم پر خوب ہنسوں۔ میں اب چپ رہوں گی۔ تم کر لو من مانیاں، مگر اتنا جان لو تمہارے ہاتھوں پر بنی لکیریں ان مٹ ہیں۔ تم انہیں بدلنا بھی چاہو تو بدل نہیں سکتیں، تم انہیں مٹانا چاہو تو یہ مٹ نہیں سکتیں، تم نے آج بھیک مانگ لی اور کل اپنی موت مانگنا۔“

وہ ہیڈ پر آکر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔

”مجھے بس تمہیں سننا تھا، دیکھنا تھا تم ابھی تک زندہ ہو یا آج میری کامیابی دیکھ کر مر گئی ہو؟“ اندھیرے میں ابھرتی ہوئی سوچ کی لہروں کو مخاطب کر کے اس نے کروٹ بدلی۔ سوچ کی لہریں ڈوبنے لگیں تھیں، اسے کوئی جواب نہ مل سکا۔ آج کا دن اور بھی سست تھا۔ وہ صبح سے کمرے میں بند پڑی تھی، کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ فاطمہ بار بار کمرے کے چکر لگا رہی تھی مگر ہر بار بند دروازہ اسے چڑا کر واپس بھیج دیتا۔

”کچھ کھانے پینے کو دل ہی نہیں کر رہا۔ ہاں بد مزہ چائے پینے کو چاہ رہا ہے۔“

اس نے سوچا اور تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آئینے کے سامنے اپنا بکھرا حلیہ سیٹ کرنے میں ذرا دیر نہ لگائی تھی اس نے، تیزی سے سیڑھیاں اترتی وہ عجلت میں کہیں جانے کو تیار تھی۔ جب باہر سے ہارن بجنے کی آواز آئی، انگنیشن میں لگی ہوئی گاڑی کی چابی پھر جسے اس کے ہاتھ پل بھر کے لیے ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

کمال چاچا نے دروازہ کھولا تھا۔ سیٹھ کریم کی گاڑی زن سے داخل ہوئی اور پورچ میں کھڑی بلیک سیڈ ان کے برابر پہنچ کر رک گئی۔ اپنی جون میں گاڑی کا دروازہ کھول کر وہ اترنے ہی والے تھے جب ساتھ والی گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی رانی نظر آئی۔ انہوں نے ہاتھ

پر بندھی گھڑی دیکھی اور تعجب سے اسے دیکھتے ہوئے اپنی طرف والا شیشے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

رانی گاڑی کو ریورس گیر میں ڈالنا چاہتی تھی، ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے اس نے کہا تھا۔
”بولیے پاپا؟“

انہوں نے پھر شیشہ کھٹکھٹایا۔

انہیں اس کی آواز سننے میں دقت ہو رہی تھی۔ گاڑی کا شیشہ بند ہونے کی وجہ سے رانی نے ان کی طرف دیکھے بغیر شیشہ نیچے کیا اور سامنے دیکھتے ہوئے ان کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔

اس کی آنکھوں میں لکھی ہوئی بیزاریت صاف پڑھی جاسکتی تھی۔

”آپ اس وقت کہاں جا رہی ہیں کوئین؟“

”papa non of your business“

اس نے قدرے اونچی آواز میں جھنجلا کر کہا تھا، جیسے ان کے اس سوال پر اسے بہت غصہ آیا ہو۔

behave your self queen ,i am your father you can't talk to me
like this”

رانی نے اس بار ڈائریکٹ ان کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر پھر سر جھٹک کر سامنے دیکھنے لگی۔

”آپ کو اپنے پاپا کو بتانا چاہیے کہ آپ اس تپتی دوپہر میں کہاں جا رہی ہیں؟“
سیٹھ کریم نے اس بار قدرے نرم لہجے میں کہا تھا۔

”مگر پاپا آپ نے تو آج تک کبھی نہیں بتایا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ کیوں جا رہے ہیں؟ اور نہ ہی آپ بے جا سوال کر کے میری پرسنل لائف میں دخل دے سکتے ہیں
”remember papa this is our standard“

اس نے انہیں ان کی کہی ہوئی بات لوٹائی تھی۔

”okeyas you wishdo what you want to do“

سخت لہجے میں بولتے ہوئے وہ پیچھے ہٹے تھے اور یہ اچھا ہی کیا تھا انہوں نے۔ اگر ایک لمحہ بھی دیر ہو جاتی تو شاید ان کا پاؤں ریورس گیر میں جاتی ہوئی سیڈ ان کے بھاری بھر کم ٹائر کے نیچے آسکتا تھا۔

”دن بدن مشکل ہوتی جا رہی ہے یہ۔“

پیشانی مسلتے ہوئے وہ سوچ رہے تھے۔ رانی کی گاڑی گیٹ کے باہر جا چکی تھی۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے مین گیٹ کے پاس آئے، کمال چاچا گاڑی کے آندھی طوفان کی طرح گزر جانے کے بعد گیٹ بند کر رہا تھا۔

”چھوٹی مالکن اس سے پہلے بھی اس وقت یادن میں کہیں آتی جاتی رہتی ہیں؟“

سرسری لہجے میں کمال چاچا کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا۔ نوکروں کو منہ لگانا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ خصوصاً اپنے گھر کی کوئی بات ان سے کرنا تو ناممکنات میں سے تھا، مگر دن بھر آفس میں رہنے والے سیڈھ کریم اپنی اکلوتی بیٹی کی مصروفیات سے یکسر لاعلم تھے۔ وہ کب یونیورسٹی جاتی تھی، کب واپس آتی تھی، جاتی بھی تھی یا نہیں اور کہاں کہاں جاتی تھی۔ یہ سب آج سے پہلے تک انہوں نے جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ پھر رانی کی تنہائی پسند طبیعت سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ اس کی آدم بیزاری کے قصے تو اکثر وہ اپنے قریبی دوستوں سے بھی سنتے رہتے تھے جنہیں وہ مختلف ایونٹس پر اپنے گھر مدعو کرتے تھے، مگر آج اس وقت اسے گاڑی میں سوار کہیں جانے کے لیے دیکھ کر انہیں عجیب سا لگا تھا۔ یہ گاڑی رانی کی انیسویں سالگرہ پر گفٹ دینے کے لیے خریدی تھی انہوں نے جسے ایک مہینے تک اس نے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اس گاڑی کو ہمیشہ پورچ میں رانی کا انتظار کرتے دیکھا تھا اور آج جب وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ان سے عجیب انداز میں

بات کر رہی تھی، وہ اس کے اندر آئی انوکھی تبدیلی محسوس کیے بنانہ رہ سکے تھے۔ اسی لیے کمال چاچا سے سرسری لہجے میں اپنی اکلوتی بیٹی کی مصروفیات دریافت کر رہے تھے۔

کمال چاچا اس گھر کا پرانا خادم تھا۔ رانی کی پیدائش پر کریم صاحب کے تمام حلقہ احباب میں پارٹی کا انوٹیشن کارڈ بانٹنے والا وہی تھا۔ رانی اس کے سامنے بڑی ہوئی تھی۔ وہ اس گھر میں آنے والی یکدم تبدیلیوں سے ہمیشہ پہلے سے واقف ہو جاتا تھا، مگر اس نے کبھی گھر کے کسی معاملے میں بولنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ سیڈھ کریم کا رویہ اور بڑی بیگم صاحب کے نخوت بھرے انداز نے کبھی اس کے اندر ہمت ہی پیدا نہیں کی کہ وہ ان کی توجہ رانی کی طرف مبذول کروانے کے لیے کچھ کہہ پاتا۔ بڑی بیگم صاحب کے کینیڈا جانے کے بعد اکیلے گھر میں ماں اور باپ کی توجہ کو ترسنے والی کم سن بچی کا شور شرابا اسے آج بھی یاد تھا۔ ماں کے جانے کے بعد چند سال اس نے کیسے گزارے تھے؟ یہ بات سیڈھ کریم سے زیادہ کمال چاچا جانتا تھا۔

پچھلے تین دن سے رانی میں آنے والی اچانک بہت ساری تبدیلیاں اس نے محسوس کر لی تھیں۔ اس رات بارہ بجے گھر سے باہر پارک میں جانا، اجنبی لڑکے سے ملنا اور واپس آکر صبح تک چھت پر کھڑے ہو کر گھڑی گھڑی پارک کی طرف دیکھنا۔ یہ سب کچھ اس نے اپنی

آنکھوں سے دیکھا تھا اور گزشتہ رات کے اس رت جگے سے بھی واقف تھا جس کا خاتمہ صبح کے سات بجے اسی لڑکے کے سامنے جا کر ہوا تھا۔ کمال چاچا جانتا تھا کہ اس گھر میں پھر کوئی بڑا طوفان آنے والا ہے، مگر وہ بول نہیں سکتا تھا، بتا نہیں سکتا تھا۔ رانی کی ایسی دیوانگی اس سے پہلے آج تک اس نے نہ دیکھی تھی۔ صبح سات بجے ننگے پیر بھاگتے ہوئے وہ گیٹ پر آئی تھی اور ایک لمحے کا انتظار کرنے کی راوا دار نہیں تھی۔ کمال چاچا نے پھولے ہاتھوں سے دروازہ کھولا تھا اور اسے سامنے کھڑے بچے کا ہاتھ تیزی سے پکڑ کر روکتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر ایک سانولے سے لڑکے کے پاس جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

”میں کیا پوچھ رہا ہوں تم سے؟ بہرے تو نہیں ہو گئے تم۔“

سیٹھ کریم کی غصیلی آواز اسے ہوش میں لے آئی تھی۔

”صاب چھوٹی مالکن تو بس یونیورسٹی ہی جاتی ہیں کبھی کبھار۔ ورنہ کمرے میں ہی بند رہتی ہیں۔ آج اللہ جانے کہاں جا رہی تھیں؟“

اس نے ڈھیلے ڈھالے لہجے میں جھوٹ بول کر سر جھکا لیا تھا۔

”اچھا بس بس... تمہیں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ کہاں گئیں ہیں اور ہاں انہیں مت بتانا کہ میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا۔ تم نوکروں کو خواہ مخواہ کن سوئیاں لینے کی عادت ہوتی ہے۔“

”

حقارت سے کہتے ہوئے سیٹھ کریم اندر چلے گئے تھے۔ اور کمال چاچا سوچ میں ڈوبی نظروں سے انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

☆...☆...☆

تیرہ جون بروز جمعہ (2013ء)

ایک اور سوال جو اس کے باپ کو دیکھ کر میرے دل میں اٹھا تھا۔

اسے سوچتے ہوئے میں ہوٹل تک پہنچا تھا۔ مرتضیٰ پھٹے پر بے ہنگم انداز میں پڑا خراٹے مار رہا تھا۔ چھوٹو نے اندر داخل ہو کر ایک گلاس میں پانی ڈال کر مجھے دیا۔ اس ننھے بچے نے میری حالت کو جان لیا تھا اور صبح کے واقعے سے متعلق ذہن میں اٹھتے ہوئے بے شمار سوالوں کو دل میں ہی دبا دیا تھا۔

میں نے پانی کا گلاس منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں غٹا غٹا چڑھا گیا۔

ہوٹل کے باہر دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہاں صبح کے وقت لوگ آتے تھے یا پھر ڈھلتی ہوئی شام کو۔ دوپہر کو میرے سامنے تو ایک دو کے علاوہ ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔ اسی لیے مرتضیٰ پھٹے پر بے ہوش پڑا تھا۔

میں نے گلاس چھوٹو کو پکڑا یا اور پھٹے کے ایک کونے میں ترچھالیٹ کر چھپر کی چھت دیکھنے لگا۔

باہر کوئی گاڑی آئی تھی اور پھر بریک لگنے کی آواز۔ گاڑی ایک آواز کے ساتھ رکی تھی۔
چھوٹو نے پلٹ کر باہر کی طرف دیکھا۔

اور بھاگتا ہوا میرے پاس آیا۔ میں نے چھت سے نظریں ہٹا کر چھوٹو کو دیکھا اور اس کی نظروں کا پیچھا کرتے ہوئے آج کے دن میں دوسری بار اسی چہرے کو جس نے مجھے آگہی کا عذاب دے ڈالا تھا۔ میٹھی اذیت کیا ہوتی ہے؟ مجھ سے پوچھا اور مجھے ہی بتا ڈالا تھا جس کے آنسوؤں نے مجھے پل بھر میں معتبر کر ڈالا تھا۔ وہ ہی میرے سامنے پھر کھڑی تھی۔

”میں نے مرتضیٰ کی طرف دیکھا، وہ ویسا ہی دھت پڑا تھا۔ چھوٹو نے اس بار منہ کھول کر دیکھنے کے بجائے مسکرا کر اسے اور پھر مجھے دیکھا تھا۔

”مجھے چائے پینی ہے۔“

اس کے لہجے میں تحکم تھا یا التجا... میں سمجھ نہیں پایا تھا۔

”ابھی لایا بیگم صاب۔“

چھوٹو نے جلدی سے کہا، مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے میری طرف دیکھا تھا۔

”مجھے بد مزہ چائے پینی ہے جس کی ایک چسکی حلق تک کڑواہٹ بھر دے جسے پینا ایک آزمائش کی طرح ہو اور ایسی چائے صرف یہی بنا سکتا ہے میرے لیے۔“

اس نے میری طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا اور چھپر سے باہر رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک اٹھا کر اندر کر لی۔

میں پھٹے سے اٹھ کر چولہے کے پاس چلا گیا۔

اس نے چھوٹو کو پکڑ کر قریب کرتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کا نام کیا ہے۔“

”مجھے سب چھوٹو بلاتے ہیں۔“

چھوٹو نے تھوڑا سا شرمناک لہجے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

”اچھا اور یہ بڑے پیٹ والے انکل، ان کا نام؟“

”مرتضیٰ۔“

اس نے صرف نام بتانے پر اکتفا کیا۔

”اچھا۔“

وہ اچھا کہہ کر کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی تھی اور میں چائے بناتے ہوئے مسکرا نے پر مجبور ہو گیا تھا۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“

چھوٹو نے اچانک ہی اس سے پوچھ لیا تھا۔

میری تمام حسیات سمٹ کر میرے کانوں میں منتقل ہو چکی تھیں۔

میں پیچھے مڑ کر دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ دونوں میری پشت کے پیچھے بیٹھ کر ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرنے میں مصروف تھے۔

”میں اپنا نام تو کسی کو نہیں بتاتی پر چلو آپ کو ایک شرط پر بتا دیتی ہوں۔“

وہ بچوں والا انداز اپناتے ہوئے بہت اثر انگیز ہو جاتی تھی، میرے کانوں نے گواہی دی تھی۔

”کیسی شرط؟“

چھوٹو نے معصوم انداز میں سوال کیا تھا۔

”آپ میرا نام کسی کو نہیں بتاؤ گے۔ یہ بڑے پیٹ والے مرتضیٰ انکل کو بھی نہیں اور یہ لمبے قد والے لڑکے کو بھی نہیں۔“

اس نے میری طرف اشارہ کیا ہو گا، مگر میں دیکھ نہیں سکتا تھا صرف سن سکتا تھا اور یہ اچھا ہی تھا۔ کانوں کی سب سے بڑی خوبی ہے، یہ صرف سن سکتے ہیں، بول نہیں سکتے۔ کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتے، اپنی طرف کھینچ نہیں سکتے، مگر آنکھوں کی زبان لفظوں سے بھی

زیادہ آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے اور وہ آنکھیں پڑھنے کے فن میں طاق لگتی تھی۔ مجھے اندر کہیں اپنی آنکھوں سے خوف محسوس ہوا تھا۔ مبادا سچ اگل دیں اور کوئی نیا امتحان مجھے اپنی کسوٹی پر پرکھنے لگ جائے اور کوئی نئی انوکھی داستان رقم ہو جائے جس کے اختتام پر میں خالی ہاتھ اس کے در پر ٹھوکریں کھاتا نظر آؤں۔ مجھے بچپن سے ایسی کہانیاں سخت ناپسند تھیں جن میں لکڑھارا شہزادی کو پانے کی خاطر اپنی جان گنوا دیتا تھا یا شہزادی لکڑھارے کی وجہ سے اپنا سب کچھ چھوڑ کر اپنی زندگی مشکل بنا دیتی تھی۔ میں دونوں کو پوری کہانی میں ہنسی خوشی رہتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا، مگر ماں اکثر مجھے کہانیاں سنا کر ناراض کر دیا کرتی تھی اور جب میں بسور کر کر وٹ بدل لیتا تھا، تب بہت پیار سے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے سینے سے لگا کر کہتی تھی ”وہ تو صرف خواب تھا، اصل کہانی تو اب شروع ہوگی۔“ اور اصل کہانی میں جو میری ماں کے اپنے دماغ کی اختراع ہوتی تھی۔ کہیں کوئی مشکل موڑ نہیں آتا تھا، نہ شہزادی کا محل رکاوٹ بنتا تھا اور نہ لکڑھارے کی کٹیا۔ میں دونوں کی خوشی بھری زندگی کی کہانی سنتے سنتے سو جاتا تھا اور اگلے دن پھر ایک نئی کہانی کی فرمائش کرتا تھا۔

”ان کو بھی نہیں بتانا آپ کا نام؟“

چھوٹو حیرت بھرے لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

کیوں؟ ان میں کیا خاص بات ہے؟

اس نے ”ان“ پر اچھا خاصا زور دے کر کہا تھا۔

”اچھا نہیں بتاؤں گا ان کو بھی۔“

چھوٹو نے راضی ہوتے ہوئے کہا تھا، اسی پل میں نے چائے کا کپ ٹرے میں رکھا اور واپس مڑا۔

وہ چھوٹو کے کان میں منمنار ہی تھی۔

”کتنا اچھا نام ہے آپ کا۔“

چھوٹو نے بچوں کی طرح قلقاری مار کر کہا تھا۔

اور اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹرے میں رکھا چائے کا کپ اٹھالیا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھنے سے اجتناب کر رہا تھا جو آج صبح میری دی ہوئی ”میٹھی اذیت“ کو اکیلے سہنے کے دعوے کر رہی تھی، اس وقت میرے سامنے بیٹھ کر چائے پینے میں مصروف تھی۔ بد مزہ چائے جسے پینے سے اس کا حلق کڑوا ہو جاتا تھا، مگر وہ چسکیاں لے لے کر پی رہی تھی۔

میں آنکھوں میں مچلتے رنگوں کو چھپانے کے لیے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا جیسے مجھے بہت سارے کام کرنے ہوں جو اس کی آمد کی وجہ سے رک گئے ہوں۔ وہ خاموشی سے چائے پی رہی تھی، مگر میں جانتا تھا میں اس کی نظروں کے حصار میں ہوں۔

یہ میری زندگی کے عجیب ترین لمحات تھے جنہیں لفظوں میں بیان کرنا بھی ایک کٹھن آزمائش ہے۔ میں نے ماحول پر ایک گہری نظر ڈال کر خود کو اندر سے ٹٹولا تھا۔ پھٹے پر سوتا ہوا مرتضیٰ، گم صم کھڑا چھوٹو اور باہر سے آنے والی ٹریفک کی آواز کے ساتھ میں اس سے کچھ کہنے کے لائق تھا؟ میں نے گھر سے نکلنے کے بعد آج صبح پہلی بار آئینہ دیکھا تھا۔ میرا چہرہ خود میرے لیے اجنبی بن چکا تھا۔ بھلے میں گاؤں کا دھاڑی کرنے والا مزدور سہی، مگر میری اٹھان اور گندمی مائل رنگ کی تعریف میرے طبقے کی بہت ساری لڑکیاں کرتی تھیں۔ آج میں نے آئینے میں اپنی جگہ کسی اور کو دیکھا تھا، پڑمرہ سا چہرہ لیے آنکھوں میں یاسیت کے ساتھ پتا نہیں کون تھا وہ؟

”تم جتنا سوچو گے اتنا الجھو گے، زیادہ سوچو مت۔“

مجھے گم صم اور نظریں چراتا دیکھ کر وہ ہولے سے بولی تھی۔

میں نے اب بھی اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا۔ مجھے اس سے بات کرنے کا سوچتے ہوئے بار بار اپنی اوقات یاد آ جاتی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ کچا آنگن گھوم جاتا تھا جس سے کہانیوں کی شہزادی کی طرح دکھنے والی اس لڑکی کی آنکھیں نامانوس ہوں گی۔ مجھے اپنی حالت پر ترس آنے لگتا تھا۔ میں چاہتا تھا اس سے کچھ بولوں کچھ ایسا جو اس اذیت کو کم کر سکے جس کا انکشاف آج اس نے مجھ پر کیا تھا۔

”میں آج رات چھت پر نہیں گزاروں گی۔“

اس نے کہہ کر پل بھر کا توقف کیا۔ میں سر جھکائے کھڑا تھا۔

”پارک کے اس بچ پر گزاروں گی۔“

اس کی چائے ختم ہو چکی تھی۔ جانے سے پہلے اس نے چھوٹو کے ہاتھ میں پانچ ہزار کا نوٹ پکڑ لیا۔

”یہ ٹپ نہیں تمہارا انعام ہے چھوٹو۔“

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے آخری بار میری طرف دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔ سب کچھ نارمل لگ رہا تھا، ایک کسٹمر آتا ہے، میرے ہاتھ کی بنی چائے کی فرمائش کرتا ہے۔ چھوٹو سے گپیں لڑاتا ہے اور اسے بھاری ٹپ انعام میں تبدیل کر کے دے جاتا ہے۔ یہ چھوٹو کی ایک مہینے کی تنخواہ سے بھی کہیں زیادہ پیسے تھے۔ اس کے جانے کے بعد وہ نوٹ پکڑے میرے پاس آیا تھا اور میں نے نوٹ اس کی جیب میں ڈال کر اس کا گال تھپتھپایا تھا۔ میٹھی میٹھی مسکان سجا کر بولنے والا بچہ نوٹ پا کر بہت خوش تھا۔

شام کے بعد رات ہو لے ہو لے اپنے پر پھیلا رہی تھی اور میں متفکر سا اندر باہر ہو رہا تھا۔ میں جانتا تھا آج وہ پارک میں ٹہلتے ہوئے رات گزار دے گی۔ اس نے اب تک جو کہا تھا وہ کر کے دکھایا تھا۔ میں ابھی تک اس کی شکل کے علاوہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا

تھا، مگر مجھے گزرے تین دنوں میں اس کے ارادوں کی پختگی پر دل ہی دل میں اسے داد دینی پڑی تھی۔ وہ جو ٹھان لیتی تھی وہ کر کے دکھاتی تھی پر میں ابھی تک الجھا ہوا تھا۔ آخر مجھ میں ایسا کیا نظر آگیا تھا اسے؟ یہ خیال مجھے سوچنے پر مجبور کر دیتا تھا کہ میں اس کے اور اپنے درمیان حائل طبقاتی فرق کو جانچنے لگ جاؤں اور میں جب بھی ایسا کرتا اور بھی سہم جاتا۔ دس بج چکے تھے۔ مرتضیٰ نے مجھے اور چھوٹو کو بچ اور کرسیاں اندر رکھنے کے لیے کہا اور خود پھٹے پر لیٹ گیا۔

ذرا سی دیر میں چھوٹو اور مرتضیٰ، دونوں نیند کی پرسکون وادی میں اتر چکے تھے، مگر میری آنکھوں میں نیند کا دور دور تک کوئی شائبہ نہ تھا۔ مجھے رہ رہ کر اس کا خیال ستائے جا رہا تھا۔ میرے اندر چھڑی جنگ ابھی تک ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس سے ملنے جانے کا مطلب اپنے سارے راز افشا کرنا تھا۔ میں اسے لا علم رکھنا چاہتا تھا اور وہ مجھے زیر کرنے پر تلی نظر آرہی تھی۔

”زیادہ بات ہی نہیں کروں گا۔ بس پوچھوں گا وہ کیا چاہتی ہے؟“

میں نے خود کو تسلی دے کر اٹھنا چاہا، مگر دوسری سوچ نے پھر مجھے لیٹے رہنے پر مجبور کر دیا۔ ”اس نے تو اسی دن بتا دیا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے، جب وہ تم سے اپنے باپ کی معافی مانگنے یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ تم کیا چاہتے ہو یہ سوچو؟“

میں زمین پر لیٹ کر سوچتے سوچتے تھک چکا تھا۔ اٹھ کر تکیہ گود میں لیے میں نے رشک سے سوتے ہوئے چھوٹو کو دیکھا تھا۔

بچپن زندگی کا سب سے خوبصورت دور اسی لیے ہوتا ہے کہ انسان اور فرشتے میں فرق نہیں ہوتا۔ اللہ نے انسان کی شروعات بہت خوبصورتی سے کی، بچپن سے، مگر اس خوبصورت وقت کا دورانیہ بڑا ہی مختصر رکھا ہے۔ شعور کی سیڑھیاں ہمیں زندگی کی تلخ سچائیوں تک لے جاتی ہیں، سب کچھ بدل جاتا ہے۔ آج اس وقت شعور کی دنیا سے پرے گہری نیند سوتا ہوا چھوٹو چند سال بعد ساری زندگی اس نیند کو ترستار ہے گا۔ بالکل میری طرح۔

اور ایک اور بھی ہے جو بے سکون ہے۔ مجھ سے بھی زیادہ۔ ہاں مجھ سے بھی زیادہ لگتی ہے۔ اس کا حال میرے سامنے صحرا میں چلتے اس مسافر کی طرح کیوں ہو جاتا ہے جو صدیوں سے سائے کی تلاش میں بھٹکتا پھر رہا ہو؟

میں اس کی توقعات نہیں جانتا۔ میں اس کی امیدوں کا مرکز کیسے بن سکتا ہوں؟ میں تو خود ادھورا ہوں کسی اور کو کیسے پورا کر سکتا ہوں؟ تاریخ بدل چکی تھی۔

میں ابھی تک ویسے ہی بیٹھا سوچ رہا تھا ”وہ اب تک بیٹھی ہوگی؟“

دل نے فوراً سے پہلے کہا تھا ”ہاں وہ اب بھی بیٹھی ہوگی اور بیٹھی رہے گی۔ جب تک تم نہیں جاؤ گے اور جو نہیں جاؤ گے، وہ کل پھر آئے گی، تمہارے ہاتھ کی بد مزہ چائے پینے۔“

”کل پھر؟“

میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کا بار بار یہاں آنا مجھے مصیبت میں ڈال سکتا تھا ”آج مجھے اس سے پوچھنا ہی ہو گا، وہ کیا چاہتی ہے؟“

☆...☆...☆

چودہ جون بروز ہفتہ (2013ء)

”میں کیا چاہتی ہوں؟“

اس نے خاموشی کے طویل دورانیے میں صرف یہی سوچا تھا کہ اب، اب وہ بتائے گا کہ وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہاں اس کے پاس بیٹھا ہے۔ وہ اس کی ایک جھلک دیکھنے کی خاطر پارک کے اس بنچ پر بیٹھا ہے۔ وہ اس کے منہ سے اپنے لیے اس کی شدتیں سننے کی متمنی تھی، جب وہ چپ تھا۔ اسے لگا لفظ ڈھونڈ رہا ہو گا، اظہار کے لیے۔

مگر اس کے بے تاثر لہجے میں پوچھے گئے ایک ہی سوال نے رانی کو ششدر کر دیا تھا، آخر کب؟ کب وہ اجنبی سے آشنائی تک کا سفر طے کر پائے گا، کب وہ سمجھ پائے گا کہ اجنبی یوں رات کو کسی پارک کے کونے میں بیٹھ کر ایک دوسرے کے بولنے کا انتظار نہیں کرتے اور ایسے سوال بھی نہیں کرتے، جیسے اس نے کیا تھا۔ کیا وہ اب تک انجان ہے؟ کیا اسے اب بھی بھروسہ نہیں ہے؟ میرے آنسو اتنے بے وقعت ہیں اس کے لیے؟ نہیں، وہ انجان نہیں ہے، اجنبی نہیں ہے، وہ انجان بن کر رہنا چاہتا ہے، مگر کیوں؟

”کیوں کہ تم رانیہ کریم خان ہو... ہا ہا ہا۔“

اسے شدت کی ٹھوکر لگی تھی، سر جھٹکتے ہوئے اٹھ کر وہ پارک کی گھاس پر چار قدم چل کے رکی تھی اور اسے دیکھا تھا جو سر جھکائے جانے کس سوچ میں گم تھا۔

”تم اب بھی واپس جاسکتی ہو، اسے کچھ بتائے بغیر، اپنی محرومیوں کی لمبی داستان سنائے بغیر، اسے کسی آزمائش میں ڈالے بغیر... تم اب بھی واپس جاسکتی ہو۔“

وہ پزل سی کھڑی تھی، کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتی تھی۔

”آپ جانا چاہتی ہیں، تو چلی جائیں۔ مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔“

اس نے پلٹ کر اسے دیکھا جو اس سے مخاطب تھا، مگر نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ واپس آگئی۔

”تم پوچھ رہے تھے نا، میں کیا چاہتی ہوں؟ تمہیں شکوہ کرنے کا حق دینا چاہتی ہوں، کیا تم یہ حق لینا چاہو گے؟“

پارک کے پیچھے گزرتی مہران اسٹریٹ پر اکا دکا گاڑیاں اب بھی چل رہی تھیں۔ پارک کے سامنے کریم پیلس والا راستہ بالکل سنسان پڑا تھا۔ لڑکے نے سر اٹھا کر سنسان راستے پر نظر جماتے ہوئے کچھ کہا تھا، مگر بہت دھیرے سے۔

”میری زندگی اس رستے کی طرح ہے۔ بالکل سنسان اور بے رونق۔“

رانی نے دونوں بازوؤں کی کہنیاں ران پر ٹکا کر ہاتھوں کے پیالے میں اپنا چہرہ تھامتے ہوئے اس کی بات سنی تھی۔ وہ اس کے جھکے سر کو اٹھتے اور پھر جھکتے دیکھ کر راستے کی طرف دیکھنے لگی۔

”یہ راستہ ہر وقت بے رونق نہیں رہتا۔ یہاں سے دن میں درجنوں گاڑیاں گزرتی ہیں۔ ان میں سے ایک میری بھی ہے، درجنوں لوگ گزرتے ہیں جن میں سے ایک تم بھی ہو۔ بچے گزرتے ہیں، اسکول کا بیگ تھامے اپنی اپنی گاڑی کو پکڑنے کے لیے، اچھلتے کودتے اور ہنسی بکھیرتے۔ یہ راستہ جو بیس گھنٹے سنسان نہیں ہوتا۔ بالکل ایسے ہی جیسے تمہارے چوبیس گھنٹے ایک جیسے نہیں ہوتے۔“

رسان سے کہتی ہوئی وہ خود پر حیران ہوئی جا رہی تھی۔ اپنے لیے آج تک وہ کبھی مثبت نہ سوچ سکی تھی یا اسے سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا اس کی اپنی پرچھائی نے۔

”میرے چوبیس گھنٹوں میں گاڑیوں کا شور ہے، لوگوں کی چیخ و پکار اور ہنسی اڑاتی نظریں ہیں، ہنسی بکھیرتی آوازیں نہیں، آپ نے سچ کہا چوبیس گھنٹے ایک سے نہیں ہوتے۔ لمحہ بہ لمحہ مشکل ہوتے چلے جاتے ہیں میری زندگی کے چوبیس گھنٹے۔“

پست آواز، نظریں زمین پر جیسے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو بول کر۔

”تم میری طرف دیکھ کر بات کر سکتے ہو۔“

وہ اجازت پر اجازت دیتی چلی جا رہی تھی مگر اس کا ہمنوا اسے رد کرتا چلا جا رہا تھا۔ وہ احتجاج کرنا چاہتی تھی پر کیسے کرتی؟ ابھی تو حق بھی نہیں ملا تھا اسے... کس برتے پر کرتی؟

”میں ایک مزدور کا بیٹا ہوں جو چھ ماہ پہلے اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔ میری ماں اور میں یہاں سے ایک ہزار کلو میٹر دور ایک گاؤں میں مٹی سے بنے ہوئے گھر میں رہتے ہیں۔

آپ نے آج تک ایسا سرونٹ کو ارٹر بھی نہیں دیکھا ہو گا جیسا میرا گھر ہے۔ میرے ماں باپ مجھے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتے تھے، آپ کے پاپا کی طرح، مگر قسمت نے مجھے مرتضیٰ

چاچا کے چھپر ہوٹل کا بیرابنا دیا۔ میں زمین پر چلنے والے ان کروڑوں لوگوں میں سے ایک ہوں جو صرف خوابوں کی دنیا بسا سکتے ہیں، انہیں سچ کا روپ نہیں دے سکتے جن کے ہاتھوں

میں لکیروں کی جگہ دراڑیں ہوتی ہیں اور وہ اپنی ساری زندگی دے کر بھی ان دراڑوں کو نہیں بھر پاتے۔ میں اس شہر میں اچھی نوکری ڈھونڈنے آیا تھا۔ سوچا تھا سیٹ ہو جاؤں گا تو ماں کو بھی بلوا لوں گا۔ میں نے انسانوں کی بھیڑ میں رلتے ہوئے اس شہر کو بھی اپنے گاؤں جیسا ہی سمجھ لیا تھا جہاں باہر نکلتے ہی دھاڑی آرام سے مل جاتی تھی اور میں اپنے گھر کے چولہے کو رواں رکھنے میں کامیاب رہتا تھا، مگر اس شہر میں گزرے یہ تین دن اور تین راتیں میرے چھوٹے چھوٹے خوابوں کا قبرستان بن چکی ہیں۔ میری دنیا بہت چھوٹی ہے میم صاب اتنی کہ آپ جیسے لوگ اسے کبھی دیکھ نہیں پائیں گے، کبھی ڈھونڈ نہیں پائیں گے۔ آپ تو خوابوں کی وہ شہزادی ہیں جن کے لیے لاکھوں شہزادے ایک دوسرے کا خون بہا کر پوری دنیا میں سرخ سیلاب لاسکتے ہیں۔ آپ میری سوچ سے بہت اوپر ہیں... میں آپ کی اس قدر مہربانی پر صرف حیران ہو سکتا ہوں میم صاب۔ آپ تو گھڑی بھر کے لیے کسی سے بات بھی کر لیں وہ ہمیشہ کے لیے آپ کا ہو جائے گا۔ میں معمولی انسان ہوں، آپ کو سمجھ نہیں پارہا۔“

کھلتے ہوئے سانولے رنگ کا لمبا سا لڑکا آج کھل کر بولا تھا، تھک ہار کے بولا تھا۔ اس کی آواز میں در آنے والا درد محسوس کر کے رانی ٹپ اٹھی تھی، مگر وہ اسے روکنا نہیں چاہتی تھی۔

اس کے سارے راز جان جانا چاہتی تھی۔ اسے دل سے اپنا نا چاہتی تھی، تبھی خود پر ضبط کر کے کچھ بھی بولے بغیر اسے سن رہی تھی۔

”مجھے بچپن میں میری ماں کہانیاں سنایا کرتی تھی میم صاب۔ ایک لکڑہارا میرے جیسا اور ایک شہزادی آپ جیسی... ان کی کسی کہانی میں لکڑہارا اور شہزادی پہلی بار خوش نہیں رہ پاتے تھے۔ پھر میں روٹھ جایا کرتا اور میری ماں ان کے تمام دکھ اپنے لفظوں سے چن کر مجھے خوش کر دیا کرتی تھی۔ تب میں خوش ہو جایا کرتا تھا میم صاب ’مگر آج میں جان گیا ہوں کہ ہر رات پہلی بار وہ مجھے سچی کہانی سناتی تھیں اور جب میں سچ سن کے مچل جاتا تھا۔ تب جھوٹ بول کر مجھے خوش کر دیا کرتی تھیں۔ سچ وہ نہیں ہے جو آپ چاہتی ہیں جو میں چاہتا ہوں، سچ وہ ہے جو آپ پہلے سے جانتی ہیں اور میں بھی۔“

سنسان رات میں اس کی دھیمی دھیمی بھاری آواز جو شدت جذبات سے رندھنے لگی تھی۔ رانی کو بے طرح اپنی طرف کھینچتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے سچے لہجے سے ہی کب تھے؟ اس انوکھی آواز اور لہجے میں دھیرے دھیرے جذب ہو رہی تھی وہ۔

”میں پوری زندگی کی کمائی لگا کر آپ کا ایک پل بھی نہیں خرید سکتا میم صاب، آپ انمول ہیں، بہت خوش نصیب ہو گا وہ جسے زندگی بھر کے لیے آپ کی ہم نوائی ملے گی۔ میں وہ

خوش نصیب نہیں ہو سکتا میم صاب، میں تو شاید اب پوری زندگی آپ کے ان لمحوں کا حساب بھی نہیں چکا پاؤں گا جو آپ نے میری جھولی میں زبردستی ڈال دیے ہیں۔“

اور ایسا کون سا لفظ باقی رہ گیا تھا جسے سن کر وہ معتبر ہو جاتی۔ وہ سرنگوں تھا، اس کے جذبات کی سچائی کے آگے۔ بس ڈرتا تھا دنیا سے اور یہ ڈر ختم کرنا اس کا فریضہ اول بن چکا تھا جو برسوں سے کسی اپنے کے انتظار میں آنکھیں خشک کر چکی تھی۔

وہ اس کی سوچی ہوئی ہر کسوٹی سے گزر چکا تھا۔

اس کے اندر چھپے ہوئے سارے اندیشے پل بھر میں غائب ہو گئے تھے اور جب اندیشے ختم ہوتے ہیں تو زندگی کی تصویر بہت خوبصورت لگنے لگتی ہے۔

آج خول پوری طرح ٹوٹنے کا وقت آچکا تھا۔

اس نے سرک کر اس کے اور اپنے درمیان کا فاصلہ ختم کیا تھا۔

اور دھیرے سے اپنا ہاتھ گود میں دھرے اس کے دونوں ہاتھوں کے اوپر رکھ کر بلا کی ملامت سے کہا تھا۔

”میں نے اپنا ہم نوا ڈھونڈ لیا ہے جس کی زندگی پر آج سے صرف اور صرف میرا اختیار ہو گا اور میرا ہر پل اس کی ذات سے جڑا ہو گا۔ میری ہر سوچ اس کے لیے ہو گی اور اس کی ہر خواہش کا محور میری ذات ہو گی۔ میں آج اس پل اس ہستی کو گواہ بنا کر تمہیں اپنا مان رہی

ہوں جسے میرے جذبوں کی سچائی کے لیے کسی گواہ کی ضرورت نہیں ہے وہ دلوں کے حال جانتا ہے۔

وہ عہد و پیمان باندھ رہی تھی، دل کی گہرائیوں سے اسے تسلیم کر رہی تھی اور وہ بت بن چکا تھا۔ اس کے ہاتھ گزرتے پل کے ساتھ ٹھنڈے پڑتے جا رہے تھے۔

”کہو اجنبی! کیا تم اب بھی اجنبی بن کر مجھ سے بات کر پاؤ گے۔ کیا تم اب بھی میری طرف نہیں دیکھو گے، کیا تم اب بھی مجھ سے پوچھو گے کہ میں کیا چاہتی ہوں؟ میں تمہارے ساتھ اپنی زندگی کا ہر پل بانٹنا چاہتی ہوں، میں اپنے سارے دکھ سنا کر تمہارے کندھے پر سر رکھ کر رونا چاہتی ہوں۔ اس بھری دنیا میں صرف تم نے زندگی کے درد کو نہیں سہا ہے۔ میں بھی ان لوگوں میں سے ایک ہوں جن کے ساتھ زندگی اچھا سلوک نہیں کرتی۔ میں بہت تنہا ہوں، بہت اکیلی ہوں اجنبی... تم نے دوسروں کے ہاتھوں درد اٹھائے ہیں۔ اپنوں سے ملنے والی تکلیف کیسی ہوتی ہے، یہ تم نہ جان سکو گے۔ میں بھری دنیا میں اکیلی ہوں اجنبی۔ تمہارے پاس ماں تو ہے، مجھے تو میری ماں نے تب چھوڑ دیا جب میں ٹھیک سے ماں بولنا بھی سیکھ نہیں پائی تھی۔ میرے باپ نے میرے لیے کوئی خواب نہیں دیکھے، اسے میری کامیابیوں اور ناکامیوں سے کبھی سروکار نہیں ہے۔ تم خوش نصیب ہو اجنبی تمہارے اپنے تمہارے اپنے بن کے رہے ہیں۔ میں نے اپنوں کی شکل میں صرف اجنبیت دیکھی ہے۔

اسی لیے آج ایک اجنبی کو اپنا بنا کر اس کے کندھے سے لگ کر اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔ میں بھی سکون کی نیند سونا چاہتی ہوں۔ اس احساس کے ساتھ کہ کوئی ہے جو میری خاطر جاگ سکتا ہے۔ میں خود سے لڑتے لڑتے تھک گئی ہوں اجنبی۔ میرے اندر کوئی ہے جو پچھلے پندرہ سال سے میری ہر سوچ پر قابض ہے، مجھے خوفزدہ کر کے اپنی تسکین کرتا ہے۔ مجھے کہتا ہے کہ میں یونہی بے مول رہوں گی، ان چاہی رہوں گی، میں تنہائی سے لڑتے لڑتے مر جاؤں گی اور میں اپنوں کی غیریت سہتے سہتے دفن ہو جاؤں گی۔ میں نے اس رات بغاوت کر دی جب تم سے مل کے آئی تھی۔ میں اس رات اپنی پرچھائی کے خلاف پہلی بار ڈٹ کر کھڑی رہی تھی۔

میں اپنی پرچھائی سے ڈر کر آنکھیں بند کر لینے والی لڑکی ہوں اجنبی، مگر تمہارے لیے میں نے اس سے لڑنا سیکھ لیا ہے۔ میں تمہارے لیے خود سے لڑ سکتی ہوں تو دنیا کی کیا اوقات ہے؟ مجھے ایک بار صرف ایک بار یقین دلادو اجنبی کہ تم میرے اپنے بن کر کبھی اجنبی نہیں بنو گے۔ میں نے اپنوں پر آج تک اعتبار نہیں کیا، لیکن تم پہر کر رہی ہوں۔ میرا بھروسہ کبھی مت توڑنا۔ ایک بار اپنے لفظوں سے مجھے اپنا مان لو۔

وہ اس کے کندھے سے لگ کر بلک بلک کر رو رہی تھی۔ بھرم ٹوٹا تھا، مگر آج نہ توڑتی تو زندگی بھر نہ توڑ پاتی۔

وہ پوری طرح اس بوجھ سے آزاد ہو جانا چاہتی تھی جسے برسوں سے سہتی چلی آرہی تھی۔
چھپر ہوٹل کا سانولا لڑکا چپ چاپ اسے روتے ہوئے سن رہا تھا۔ وہ بچوں کی طرح ہچکیوں
سے رو رہی تھی۔ جیسے تین دن پہلے وہ روتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔

کچھ دیر بعد رانی کی ہچکیوں میں کمی آئی تھی۔ تب اس نے محسوس کیا، وہ جانے کب سے اس کا
ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر تھپتھا رہا تھا۔ اس نے روتی ہوئی سرخ آنکھوں سے اس کی
طرف دیکھا جواب پورے استحقاق کے ساتھ اس پر نظریں گاڑے ہوئے تھا اور جب بولا تو
پہلی بار رانی کو محسوس ہوا، کوئی مرد اس سے مخاطب ہے۔

”وقت اور حالات کل مجھے کہاں لے جائیں میں نہیں جانتا، مگر آج اس پل میں پوری
ایمانداری سے اقرار کرتا ہوں کہ آپ میرے دل پر قابض ہو چکی ہیں۔ میں اپنی پوری
زندگی آپ کی خوشیوں کی خاطر ننگے پاؤں دھوپ میں کھڑے رہنے کو تیار ہوں، مگر آپ کو
مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا آپ کو قسم کھانی ہو گی کہ آپ میری خاطر اپنوں کو نہیں
چھوڑیں گی۔ آپ ان کی عزت کا پاس رکھیں گی بالکل ایسے ہی جیسے آج سے آپ میری
عزت کا پاس رکھیں گی۔“

گھمبیر لہجے میں کہتا ہوا وہ اسے بڑی آزمائش میں ڈال رہا تھا۔

”میرا آج سے پہلے تک کوئی اپنا نہیں تھا۔“

اس نے احتجاج کیا تھا۔

”اپنوں کے اپنے پن کو سمجھنے میں بعض اوقات دیر ہو جاتی ہے۔ ہم ان سے ناراض ہو سکتے
ہیں، مگر انہیں جھٹلا نہیں سکتے۔ آپ سے کچھ بھی نہیں مانگ رہا۔ اس لیے کہ آپ کو کچھ دینا
بھی میرے اختیار میں نہیں ہے۔ بس ایک قسم آپ کو میری خاطر کھانی ہو گی، اس کے
بعد میں آپ سے زندگی بھر کچھ نہیں مانگوں گا۔“

مضبوط لہجے میں کہتا ہوا وہ اس کے لیے کوئی راہ فرار نہ چھوڑ رہا تھا۔

”تم مجھے اس احساس کی حفاظت کرنے کا کہہ رہے ہو جس کا گلا میں نے برسوں پہلے اپنے
ہاتھوں سے گھونٹ ڈالا تھا۔ مجھے آج، بس آج اس پل احساس ہوا ہے کہ اس دنیا میں میرا
کوئی اپنا بھی ہے۔“

اس نے پھر بھی فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔

”اور اس اپنے کی التجا آپ کبھی رد نہیں کریں گی۔ آپ کو یہ قسم تو کھانی ہی ہو گی۔“

اس کے لفظوں سے چھلکتا مان بے بس کر گیا تھا رانی کو۔

”ٹھیک ہے، میں قسم کھاتی ہوں، مگر ایک قسم تمہیں بھی کھانی ہے۔ میرے اپنوں کی خاطر

تم مجھے کبھی نہیں چھوڑو گے۔“

”مجھے منظور ہے۔“

اس نے بلاتا خیر کہا تھا۔

وہ ابھی تک اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے تھا۔

اذان کی آواز نے دونوں کے ہاتھوں کو الگ کیا تھا۔ وہ آج اپنے ہاتھوں پر کسی اپنے کا لمس پا کر مسرور تھی۔

اس نے دل سے نماز فجر کی نیت کی اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”میں آج برسوں بعد نماز فجر ادا کروں گی۔ آخر اللہ کو مجھ پر رحم آہی گیا۔“

کہہ کر تیزی سے چلتی ہوئی وہ باڑھ پھلانگ گئی۔

اور آج کریم پیلس کی روشنیاں اسے بہت اچھی لگ رہی تھیں، دل کا موسم اچھا تھا۔

اور جب دل کا موسم اچھا ہو تو کائنات کے سارے موسم پیارے لگتے ہیں۔

☆...☆...☆

چودہ جون بروز ہفتہ (2013ء)

سات آسمانوں کے پیچھے چھپی ہوئی وہ عظیم ذات، فیصلے یوں بھی کرتی ہے؟ جسے ہم شاہ رگ سے زیادہ قریب پاتے ہیں، ایسے بھی نواز دیتی ہے؟ اس نے مجھے چن لیا؟ کسی کی آس کی

ٹوٹتی ہوئی ڈوری کو مجھ سے جوڑ دیا؟ جو آج تک خود کو بے وجہ جینے پر مجبور سمجھتی تھی۔ آج اس کے دل کی دھڑکن بنا دیا؟ میں نے سن رکھا تھا، زندگی کا ہر باب پچھلے باب سے مختلف ہوتا ہے، جو ہم سوچ بھی نہیں سکتے، وہ ہمارے سلسلہ حیات میں درج ہو چکا ہوتا ہے اور جسے ہماری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہو جاتیں ہیں، وہ بس نظر کا دھوکا ثابت ہوتا ہے۔ میں بے گھر تھا، بے یار و مددگار تھا، مگر آج کسی کی سانسوں کا ذریعہ بن چکا تھا، کسی کی امیدوں کا محور بن چکا تھا۔ زندگی امتحان لیتی ہے، اگر یہ امتحان تھا، تو بہت دلفریب، بہت خوبصورت۔ میں پل پل بدلتے زندگی کے رنگوں میں کہیں کیف کی لہروں میں بھٹک رہا تھا، سرشار تھا۔ میرے قدم آج واپس کٹیا میں جاتے ہوئے افسردہ نہ تھے۔ ہاں ایسا ہی لگتا ہے، چاہے جانے کا احساس بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ میں اس کی سنگت میں گزرے ان لمحوں میں زندگی کا وہ روپ دیکھ کر آیا تھا جسے پا کر لوگ مکمل ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں اتنی ہنگامہ خیزیاں شاید اسی وجہ سے ہیں۔ لوگ ان لمحوں سے بیگانہ رہ کر ادھوری زندگی جینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، وہ اپنا ادھورا پن دنیا کی رعنائیوں میں تلاش کرتے ہیں، مادیت پرستی کی کبھی ختم نہ ہونے والی بھول بھلیوں میں گم ہو کر خود کو کھو بیٹھتے ہیں، مگر اپنی ذات کا وہ حصہ کبھی نہیں ڈھونڈ پاتے جو ان کی تشنگی کا سبب ہوتی ہے۔ میں ہواؤں میں اڑتا ہوا جا رہا تھا۔ اوقات بھولنے لگا تھا، دنیا کے سارے معیار بودی لگ رہے تھے۔ بس وہ اور اس کی قربت میں گزرے پل، ان پلوں

میں کی جانے والی باتیں مجھے اپنی کل متاع لگ رہی تھیں۔ میری زندگی کا حاصل وصول لگ رہی تھیں، سامنے کٹیا آچکی تھی اور اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔

کیا کہا تھا اس نے؟ ”میں آج برسوں بعد نماز ادا کروں گی۔“

اک عجیب سی احساسِ تفاخر کی لہر اٹھی تھی میرے وجود میں، وہ اللہ کا شکر بجالانے لگی تھی، کیوں کہ میں اس کی زندگی میں شامل ہو چکا تھا، جسے بہت مان سے اور دل سے اپنا جان کر جانے کتنے عہد و پیمان باندھ گئی تھی وہ۔

”اور جو میری ماں مجھے روک لیتی۔ میں اس شہر کی آب و ہوا سے انجان رہ جاتا تب؟“

تب وہ بھی مجھ سے انجان رہ جاتی اور میں خود سے؟ کیسے جان پاتا کہ میں کون ہوں؟ میں تو صرف پرویز گل تھا۔ پروہ کہتی ہے میں اجنبی ہوں پر اپنوں سے بڑھ کر ہوں۔ میں کیسے جان پاتا کہ میں کسی کی ہستی کا گمشدہ پہلو ہوں جسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ پاگل ہوتی چلی جا رہی تھی۔ آج نماز ادا کر کے ایک اجنبی کو دعائیں مانگے گی اور وہ اجنبی میں ہی تو ہوں۔ کیسے جان پاتا کہ ہے کوئی اس شہر میں بھی جہاں انسان راکھ کے ڈھیر میں سوئی کی طرح گم ہو جاتے ہیں، مگر وہ مجھے دعاؤں میں مانگتی ہے۔

میں نے وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔

چھوٹو اور مرتضیٰ اسی طرح غافل سو رہے تھے جیسے چند گھنٹے پہلے میں انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ نماز کے بعد میں نے دعائیں آج بس اسی کی خوشی اور اطمینان قلب کا سوال کیا تھا اللہ سے۔ وہ اندر سے کتنی بے سکون تھی، مجھے آج اندازہ ہوا تھا۔ مجھے میرے سب سوالوں کے جواب مل چکے تھے۔ وہ اپنوں کی ستائی ہوئی تھی، ان کی بے رخی سہتے سہتے اس کی روح نا آسودہ ہو چکی تھی۔ میں اس کی آسودگی کے لیے اللہ کے سامنے دست طلب دراز کر رہا تھا۔

اس نے آج میرے لیے قسم کھائی تھی، خود سے جڑے ان رشتوں سے منہ نہ موڑنے کی قسم جو اس کے لیے مر چکے تھے، وہ کسی رشتے کو اعتبار کا درجہ دینے سے انکاری تھی، پر میری خاطر اس نے یہ قسم بھی اٹھالی تھی اور میں اتنا خود غرض کیسے بن جاتا؟ اسے اس کے اپنوں سے چرا کر کہاں لے جاتا؟ وہ میری بن چکی ہے میں جان گیا تھا، مگر اس اپنی کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا، تو میں اسے اپنے ننگ دائرے میں گھسیٹ کر زندگی کو اس پر بوجھ کی طرح کیسے لاد سکتا تھا۔ مجھے بس یہ کرنا تھا، اسے احساس دلانا تھا کہ میں اس کا بن چکا ہوں اور اب اسی کا رہوں گا۔ یہ اپنا پن اس کی تشنگی کو دور کر دے گا۔ برسوں کی پیاس بجھا دے گا، تب میں اسے زندگی کے حوالے کر دوں گا۔ جب وہ اس پر اعتبار کرنا سیکھ لے گی، تب وہ خود کو اس بھری دنیا میں تنہا محسوس نہ کرے گی۔ تب کوئی شہزادہ آئے گا۔ کہانیوں والا شہزادہ اور اس شہزادی کو اپنے پیار کی طاقت سے لکڑہارے سے چھین کر لے

جائے گا۔ لکڑہارا وہ بھی تو یہی چاہتا ہے کہ اس کی شہزادی زندگی کے آخری پل تک ہیرے اور موتیوں میں تلتی رہے۔ یہ میری کہانی کا لکڑہارا تھا جسے ایک شہزادی کا لکڑیاں کاٹنا منظور نہیں تھا۔

رات کے پرسمٹ چکے تھے۔ مرتضیٰ بھی کسماتے ہوئے اٹھ چکا تھا۔ میں نے جائے نمازہ کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر پورے خلوص سے کہا تھا۔
”السلام وعلیکم چاچا۔ صبح بخیر۔“

میری آواز میں شائستگی اور بشاشت دیکھ کر اس کی آنکھ پوری طرح کھل گئی۔

”خیر تو ہے باؤ... آج بڑے ادب سے سویرہ اسلام دے رہے ہو؟“

اس کی حیرت بجا تھی، میں پوری کوشش کے باوجود اس سے بات کرتے ہوئے لہجہ نرم نہیں رکھ پاتا تھا، مگر آج بات ہی اور تھی۔ آج مجھے اس پر بھی بے طرح پیار آ رہا تھا، وہی تو تھا مجھے یہاں لانے والا۔ اس کٹیا میں بسانے والا، اس شہزادی کے باپ کی گاڑی پر پانی پھنکوانے والا اور مجھے اس کے محل کے سامنے جا کر رونے پر مجبور کرنے والا۔ میں دل ہی دل میں اس کا ممنون ہو رہا تھا۔ اس کی شکل آج مجھے ذرا بھی بری نہ لگ رہی تھی۔

”چاچا میں بے ادب تو کبھی بھی نہیں ہوا تمہارا۔“

میں نے میٹھے لہجے میں کہا تھا۔

”تم نے مجھے زندگی کی اصل خوبصورتی سے روشناس کروادیا، تم نے میری صبح و شام میں دھنک رنگ بکھیر دیے، مجھے میرے ہونے کا احساس دلوا دیا۔ تمہارا بے ادب کیوں کر ہوں گا میں۔“

میں دل سے بول رہا تھا اور مرتضیٰ مجھے نا سمجھی سے دیکھ رہا تھا۔ اسے سمجھ میں آ بھی کہاں سکتا تھا۔ تھوڑی دیر تک مجھے تکتے رہنے کے بعد وہ سر جھٹک کر بولا تھا۔
”اچھا اچھا زیادہ باتیں مت بنا اور چھوٹو کو اٹھا کتنا سوتا ہے کم بخت۔“

وہ ٹوٹی کے پاس پہنچ کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا اور میں چھوٹو کو اٹھانے چلا گیا۔
ہوٹل کھل چکا تھا۔ اکا دکا لوگ آرہے تھے۔ میں آج بھاگ بھاگ کر سب سے آرڈر لے رہا تھا۔ ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ آج مجھے کسی کا ”اوائے چھو کرے“ کہہ کر پکارنا بھی بُرا نہ لگ رہا تھا۔ کپڑوں سے پسینے کی ناخوشگوار بو بھی بُری ناگ رہی تھی۔ میری آنکھوں میں رت جگے کا شائبہ تک نہ تھا۔ مجھے ہوٹل کے ارد گرد کا منظر بہت صاف اور نکھر نکھر الگ رہا تھا۔ کبھی کبھی اچھٹی سی نظر دور سے نظر آنے والے کریم پیلس پر پڑتی ’تو دھیمی سے مسکان میرے لبوں سے چسپاں ہو جاتی۔ آج زندگی بدلی بدلی لگ رہی تھی یا میں بدل چکا تھا۔

دن اپنی تمام تر خوبصورتی سے گزر رہا تھا اور رات دھیرے دھیرے قریب آرہی تھی۔ شاید زندگی اپنے دامن سے کچھ اور خوبصورت پل مجھے دان کرنے والی تھی، کسی کی آنکھوں کا دیپ بن جانا کتنا خوش کن ہوتا ہے۔ یہ میں نے آج جانا تھا۔

☆...☆...☆

چودہ جون بروز ہفتہ (2013ء)

”انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔

اب کوئی میرے لیے تڑپتا ہے، میں کسی کے لیے اہم ہو چکی ہوں، میرے آنسو قیمتی ہو چکے ہیں، ملال دھلتا جا رہا ہے، شکست کا خوف دل سے نکلتا جا رہا ہے، اس نے مجھے اپنا مان لیا ہے، وہ میرے لیے قیمتی دھوپ میں ننگے پاؤں زندگی بتانے کا دعوے دار ہے، میں نے روٹھی ہوئی زندگی کو منا لیا ہے، میں نے کسی اپنے کو پالیا ہے۔ آج میرا تم سے ہر رشتہ ختم، نہ ضد کا نہ جنگ کا۔ میں آج کے بعد تم سے بات نہیں کروں گی، اس نے مجھے قبول کر کے تمہاری شکست کا سامان کر دیا ہے، اب منہ تم چھپاتی پھرو... میں آج سے سراٹھا کر جیوں گی، تم نے مجھ سے جو کڑی تپسیا کروائی ہے، اس کے لیے تمہارا شکریہ میری مہربان۔“

آسودگی سے سوچتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ کوئی نہیں بولا تھا، ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔ وہ نماز فجر ادا کرنے کے بعد اللہ کے آگے سجدہ شکر بجالائی تھی۔ اس کے درد سمیٹ کر زندہ انسانوں میں لا کھڑا کیا تھا اسے وہ جو سب کے دلوں کے حال جانتا ہے، وہ جو نیتیں دیکھ کر فیصلے کرتا ہے۔ بس ”کن“ کہتا ہے اور دنیا کی تاریخ بدل جاتی ہے۔ وہ تو بس اس کی ادنیٰ سی تخلیق تھی اور آج اس نے اس کے لیے بھی دعا کی تھی جو انجانے میں اس کی حسرتوں کو سانسیں بخش گیا تھا۔ کتنا الگ سا دکھتا تھا جب اس کے ہاتھ کو ہولے سے تھپتھپاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی سب سے قیمتی چیز اس کے قدموں میں ڈال رہا تھا اور وہ اس قیمتی چیز کو متاع جاں سمجھ کر ہمیشہ سنبھال کے رکھنے والی تھی۔ وہ اس کے سنگ زندگی کا سفر کرنے والی تھی۔ اسے اس کی حالت سے کوئی مطلب نہیں تھا، وہ اس کی ہو کر رہنے والی تھی، وہ جہاں بھی رکھے گا، اس کی اصل جگہ تو اس کے دل میں ہوگی۔ یہی اقرار تو کر کے گیا تھا وہ سانولا سا اجنبی لڑکا۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے کچن میں کھڑی فاطمہ پر نظر پڑ گئی تھی اس کی اور اپنے کمرے میں جانے کے بجائے اس کے پاس چلی گئی تھی۔

”چھوٹی بی بی... میں بس آپ کا ناشتا آپ کے کمرے میں لانے ہی والی تھی۔“

فاطمہ نے اسے سر پر کھڑا دیکھ کر کہا تھا 'مگر اگلے پل وہ ہکا بکارہ گئی۔ جب رانی نے اس کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر کہا تھا۔

”فاطمہ آنٹی! آپ نے کبھی بد مزہ چائے پی ہے؟ جس کی ایک چسکی آپ کا حلق کڑوا کر دے اور آپ کے لیے وہ چائے آزمائش بن جائے؟“

”ہیں جی... نہیں چھوٹی بی بی۔ میں تو میری چائے تو ایسی نہیں ہوتی۔“

فاطمہ بوکھلا کر بولی تھی۔ اس نے کچھ اور ہی سمجھ کے صفائی دینا چاہی تھی 'مگر رانی نے اس کے لبوں پر انگلی رکھ کر "شش" کی آواز نکالی اور اسے پیچھے کر کے خود چولھے کے پاس کھڑی ہو گئی۔

”تو آج آپ کو میں پلاتی ہوں ایسی چائے۔“

ماچس کے لیے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

اور فاطمہ ہڑبڑا کر آگے ہوتے ہوئے بولی تھی۔

”نہیں میں بنا لیتی ہوں اپنے لیے بھی اور آپ کے لیے بھی۔ آپ نے اس سے پہلے کبھی چائے نہیں بنائی چھوٹی بی بی۔“

مگر وہ اپنی ہی دھن میں چولھا جلاتے ہوئے اب چائے بنانے کی تیاری کر رہی تھی۔

”اسی لیے تو کہا ہے آپ کو کہ آج سے پہلے کبھی بد مزہ چائے پی ہے یا نہیں۔ اب تیار ہو جائیے! ایک سبب بھی نہیں چھوڑنا آپ نے۔“

روانی سے بولتے ہوئے چائے بنانا شروع کر دیا تھا اس نے۔

اپنے اور فاطمہ کے لیے چائے بنانے کے بعد وہ کپ لے کر فرسٹ فلور پر آگئی تھی۔ لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے کے ارادے سے۔

صبح کے نو بج چکے تھے۔ سیٹھ کریم اپنے کمرے سے تیار ہو کر آفس کے لیے نکل رہے تھے جب لاؤنج میں پہنچ کر انہوں نے رانی کو صوفے پر آڑا تر چھالیٹے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ بے سدھ سو رہی تھی۔ سامنے چائے کا خالی کپ پڑا تھا۔

وہ اس کے قریب پہنچے ٹی وی کا ریموٹ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ ریموٹ آہستہ سے اس کے ہاتھ سے چھڑا کر ٹی وی آف کیا تھا انہوں نے اور باہر جانے کے بجائے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سیکنڈ فلور پر پہنچ گئے۔ سامنے فاطمہ کچن میں برتن دھونے میں مصروف تھی۔

”سلام صاب جی۔“

انہیں کچن کی طرف آتا دیکھ کر اس نے آگے بڑھ کر تیزی سے سلام کیا تھا۔

”چھوٹی بیگم صاحبہ رات کو کب سوتی ہیں؟“

اس کا سلام نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے سوالیہ انداز میں پوچھا تھا۔

”پتا نہیں صاب جی کمرے میں تو رات کے دس بجے گھس جاتی ہیں۔“

فاطمہ نظریں چرا کر بولی تھی، کیوں کہ سچ بتانے کی صورت میں سب سے پہلے اسے ہی جھاڑ پڑنی تھی۔ اب وہ کیسے بتاتی کہ بی بی جی رات کمرے میں تو کیا گھر میں بھی نہیں تھیں۔
”اچھا۔“

انہوں نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ اچھا... اچھا کو خاصا کھینچ ڈالا تھا۔
”رات کو دس بجے اپنے کمرے میں چلی گئیں اور صبح کے نو بجے لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے دیکھتے سو گئیں۔“

سخت لہجے میں اسے گھورتے ہوئے کہا تھا انہوں نے۔

”اللہ جانے صاب جی، میں تو خود آج حیران رہ گئی۔ ابھی صبح اٹھ کر پکن میں آکھڑی ہوئیں تھیں اور خود ہی چائے بنانے لگیں۔ ساتھ میں میرے لیے بھی بنادی۔“
وہ ہڑبڑا کر بول رہی تھی جب انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے کہا تھا۔

”بس بس... میں جانتا ہوں وہ آدھی آدھی رات تک چھت پر کھڑی رہتی ہیں۔ تم بات کو گول گول مت گھمایا کرو۔ جتنا پوچھا جائے اتنا بتایا کرو اور سچ سچ بتایا کرو۔“
انگلی کے اشارے سے اسے وارننگ دیتے ہوئے وہ مڑ کر نیچے اتر گئے تھے۔

اور اسے اسی طرح بے سدھ چھوڑ کر وہ باہر نکل گئے تھے۔

دن کے بارہ بج رہے تھے جب اس کی آنکھ کھلی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر بیڈ پر پڑا ہوا سیل بے دھیانی میں اٹھایا تھا اس نے۔
اس کی ماما کی دوکانز آچکی تھیں۔

وہ بیڈ کے ایک کونے پر ٹکتے ہوئے ان کا نمبر ری ڈائل کرنے لگی۔

اور دوسری طرف سے پہلی بیل پر فون اٹھالیا گیا تھا۔ اسے اپنی ماما کی آواز سنائی دی۔
”ہیلو رانی... مائی بے بی کیسی ہو تم؟ اور ماما کا فون کیوں نہیں اٹھاتی تھیں۔ ماما سے بات کرنے کو دل نہیں چاہتا آپ کا؟“

اس نے فون کو کان سے ہٹا کر گھورا تھا۔

کاش... اے کاش یہ آواز سن کر میرے اندر کوئی اچھوتا احساس جاگ اٹھتا جیسے ماں کی ممتا محسوس کرنے سے اٹھتا ہے، گر وہاں سب خالی خالی تھا۔

”ہائے مام۔“

اس نے ڈھیلے ڈھالے لہجے میں کہا تھا۔

”مجھے بتاؤ کیسی ہو کیا کر رہی ہو آج کل۔“

”nothing mom“

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

”you know ””” why my child ? something is better then nothing
it naaa”

”yaa mom but its okey with me ”

اس نے قدرے بے رخی سے کہا تھا۔

دوسری طرف چند لمحوں تک خاموشی رہی، جیسے سوچا جا رہا ہو۔ اب کیا بولنا ہے؟
پھر اس کی ماما کی آواز قدرے ناخوش گوار لہجے میں سنائی دی۔

”بیٹا آپ کے پاپا سے میری بات ہوئی ہے۔ میں چاہتی تھی آپ کچھ عرصہ میرے پاس رہیں
یہاں کینیڈا میں، مگر آپ کے پاپا نے مجھے دو ٹوک انکار کر دیا۔ وہ کہتے ہیں آپ کبھی راضی
نہیں ہوں گی اور وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ آپ مینٹلی ڈسٹرب ہیں اور کسی سائیکالوجسٹ
کے پاس آپ کا علاج بھی چل رہا ہے۔ بیٹا آئی نو کہ آپ کے پاپا ایک کنیر لیس انسان ہیں۔
اسی لیے میں چاہتی تھی کہ آپ کچھ عرصہ میرے پاس رہیں تو بہتر محسوس کرتیں۔“
اس کی ماما نے ایک اچھی ماما کی ڈیوٹی نبھانے کی پوری کوشش کی تھی، مگر اب اس کی ضرورت
نہیں رہی تھی۔ اس نے انہیں خود ہی ان کی ہر ذمہ داری سے آزاد کر دیا تھا۔

”no mom its okey i am fine, dont so worry about me and bye
mom i actually have somthing to do now”

بے جان لہجے میں کہتے اس نے فون بیڈ پر پھینک دیا اور آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی
تھی۔

تھوڑی دیر تک خود کو ہر زاویے سے اچھی طرح دیکھنے کے بعد اس نے گنگناتے ہوئے
وارڈروب کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اپنے لیے ایک اسٹائلش سے سوٹ کا انتخاب کر کے وہ
واش روم میں گھس گئی تھی۔ آج اسے اپنے چاہنے والے سے ایک نئے انداز میں ملنا تھا۔ اس
کا بھی حق تھا کہ کوئی اسے سراہتی ہوئی نظروں سے دیکھے اور اپنی قسمت پر رشک کرے۔

☆...☆...☆

بائیس جون بہ روز اتوار (2013ء)

ایک دوسرے کی رفاقت میں جون کی راتیں کاٹتے ہوئے ہمیں ایک ہفتے سے اوپر ہو چلا تھا
، میں نے اپنی زندگی کا ورق ورق اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا اور اس کی طویل کٹھن
مسافت کے ایک ایک قدم سے واقف ہو چلا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی محبت میں پور

پور ڈوب چکے تھے۔ جون کا چاند ہمارے تمام راز و نیاز سے واقف تھا، ہمیں دیکھ کر مسکراتا رہتا تھا اور وقفے وقفے سے اپنی چاندنی کی چادر سے ہماری آنکھوں میں ایک دوسرے کے لیے چمکتے جگنوؤں کو دیکھتا رہتا تھا۔

محبت انسان کو اندر سے ہی نہیں باہر سے بھی خوبصورت بنا دیتی ہے۔ وہ یہی کہہ کر مجھے احساس دلاتی تھی کہ میں اللہ کی بنائی ہوئی اس دنیا میں اس کی سب سے خوبصورت تخلیق ہوں اور میں، میں تو اسے نظر بھر کر دیکھتے ہوئے ڈرتا تھا۔ نظریں تو اکثر اپنوں کی ہی لگتی ہیں۔ اسی لیے کتر اجاتا تھا۔ تب وہ دھیمی سی ہنسی ہنس کر مجھے زبردستی اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ میں دیکھتا تھا اور گھائل ہو جاتا تھا۔ وہ میری بے اختیار نظروں اور بے قرار دھڑکنوں سے کھیل کر حظ اٹھاتی تھی اور پارک کی خاموش فضا میں جلتارنگ ہنسی بکھیرتی تھی۔ ہم دنیا جہان کی باتیں کرتے تھے، اسے موسموں کی باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ وہ برسات کی دیوانی تھی، اے کاش ایک بار صرف ایک بار میں اسے اپنے گاؤں لے جا کر اپنے گھر کے کچے آنگن میں کھلے آسمان کے نیچے کھڑا کر دیتا اور ہم دونوں مل کر دعا کرتے۔ برسات ہو جانے کی دعا... تب اچانک آسمان سے بادل اٹھتے کالی گھٹا چھا جاتی اور ٹپ ٹپ بارش کی بوندیں گرتیں۔ وہ اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر بارش کی پہلی بوند پا کر کتنا خوش ہوتی۔ گھر کا

کچا آنگن بارش اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے مہک اٹھتا۔ تب میں ہولے سے اس کا ہاتھ تھام کر اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں میں دیکھ کر کہتا:

”ٹھہر جاؤ...“

کہ دل کے خشک آنگن میں
ابھی برسات ہونی ہے

مگر میں کبھی نہ کہہ سکتا تھا۔ وہ زندگی کو ہولے ہولے جینا سیکھ رہی تھی، دل سے ہنسنا سیکھ رہی تھی، دل کی باتیں کرنا سیکھ رہی تھی، میرے لیے یہی کافی تھا کہ وہ آج میرے سنگ تھی۔ مجھے کل کی فکر کر کے اسے واپس اسی سٹائے میں نہیں دھکیلنا تھا جس نے اس کا بچپن چھین لیا تھا۔ آج اسے کھکھلاتے دیکھ کر میں نے ایک اور التجا کی تھی۔

”آپ سب کو دل سے معاف کر دو۔“

”سب کون؟“

میرے لفظوں کا مفہوم سمجھتے ہوئے بھی انجان بن رہی تھی وہ....

”آپ کے پاپا اور آپ کی ماما۔“

”کر دیا...“

اس نے فوراً ہی کہہ دیا تھا، مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی مان جائے گی۔

”سچ مجھ۔“

میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

”ہاں ...“

اس کا مختصر جواب۔

”تو پھر آپ ماما کی بات مان کیوں نہیں لیتیں؟ کچھ دن کے لیے چلی جائیے ان کے پاس۔“

اس نے زور زور سے نفی میں سر ہلا کر مجھے غصیلی نظروں سے گھورا تھا۔

”رہ پاؤ گے میرے بغیر؟“

اس کے سوال نے مجھے ہونٹ بھیج کر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”ماما مجھے میری محبت میں نہیں بلارہیں۔ وہ مجھے ابنار مل سمجھتی ہیں اس لیے کینیڈا میں میرا

علاج کروانا چاہتی ہیں۔“

اس کا وہی پتھر یلا لہجہ لوٹنے لگا تھا۔

”ضروری تو نہیں ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے وہ آپ کو مس کر رہی ہوں، آپ کو دیکھنا چاہتی

ہوں، آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ آپ کے ساتھ وقت بتانا چاہتی ہوں۔“

میں نے اس کی سوچ کا رخ تبدیل کرنا چاہا تھا، اس نے زخمی نظروں سے مجھے دیکھا۔

”مس کرتیں، دیکھنا اور ملنا چاہتیں، تو ان پندرہ سالوں میں ایک بار پندرہ منٹ کے لیے ہی

یہاں میرے پاس آجائیں۔ وہ اپنی زندگی میں خوش ہیں۔ انہیں میری یاد آرہی ہوتی تو مجھے

نہ بلاتیں بلکہ خود آجائیں۔“

”ہو سکتا ہے ان کے کچھ پراہلزم ہوں، مصروفیات ہوں۔ اس لیے چاہ کر بھی نہ آ پارہی

ہوں۔“

میں نے اب بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔

”پراہلزم میرا بھی ہے۔ میں تم سے ملے بغیر ایک دن بھی نہیں گزار سکتی۔ تم میرا سب کچھ بن

چکے ہو اجنبی، میں اتنے دن وہاں کیسے کاٹوں گی، دیار غیر میں غیر لوگوں کے بیچ؟“

اپنی ضد پر ثابت قدم رہتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

”وہاں آپ کی ماں رہتی ہیں۔ ان کی اپنی اچھی خاصی گید رنگ ہوگی وہاں جو آپ کو بور نہیں

ہونے دے گی۔“

اسے منانا مشکل کام سہی، مگر میں یہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کی روز بروز بڑھتی دیوانگی مجھے ڈرانے

لگی تھی۔ وہ ہر خوف سے بے نیاز تھی۔ اسے صرف میری پروا تھی اور مجھے اس سے زیادہ

اس کی۔ اسی لیے جب اس نے مجھ سے اپنی ماں کی کہی ہوئی باتیں دہرائیں تھیں، تو مجھے لگایہ

وقت صحیح ہے۔ وہ ماں کے پاس جاتی، نئے چہروں سے ملتی، یہ بھی ممکن تھا ماں سے پیدا ہونے

والی بدگمانیوں میں کمی آتی، اسے زندگی کو جینے کے لیے ایک نیا رخ مل سکتا تھا۔ وہ رخ جو اسے پارک میں بیٹھے ہوئے اجنبی لڑکے سے زیادہ دلچسپ لگتا، مجھے اس کی چاہتوں سے انکار نہیں تھا، مگر کوئی مجھے بار بار کہتا تھا۔ تم اس لڑکی کے قابل نہیں ہو یہ محبت اور توجہ کو ترسی ہوئی لڑکی ہے۔ تم اس کی زندگی میں اس کے اپنوں کی وجہ سے بن جانے والے خلا کو اپنی سیڑھی بنا کر اس سے اس کی زندگی چھین نہیں سکتے، یہ تمہارے اندر ان سب رشتوں کو ڈھونڈ رہی ہے جن کے لیے یہ ترستی رہی ہے۔ تم اس کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھا کر محبت میں غرض کا پیوند لگا کر سرخرو نہیں ہو سکتے۔ میں اسے چاہتا تھا، اسی لیے صرف خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ میری اولین ترجیح اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک دیکھنا تھی۔ اسے چرانے کا خیال میں سختی سے دباتا چلا آ رہا تھا۔

میری بات سن کر وہ آپے سے باہر ہونے لگی تھی۔

”تم مجھے کیوں خود سے دور کرنے پہر مجبور کر رہے ہو؟ میں نے کہا نا مجھے نہیں جانا کہیں بھی۔ مجھے بس تمہارے پاس رہنا ہے۔ میں وہاں کیوں جاؤں؟ کس کے لیے جاؤں؟ اس عورت سے ملنے جو مجھے چار سال کی عمر میں بلکتا چھوڑ کر اپنی خوشیاں تلاش کر رہی تھی؟ جو پچھلے پندرہ سالوں میں میری آواز اور تصویروں کے علاوہ کچھ بھی نہیں جانتی میرے بارے میں؟ اور تم چاہتے ہو میں اسے ماں کا درجہ دے کر اس کے پاؤں میں جنت ڈھونڈنے پہنچ

جاؤں۔ مجھے نہیں چاہیے ایسی جنت جو ایک خود غرض عورت کے قدموں تلے رلنے کے بعد میرے مقدر میں آئے۔

وہ ہذیبانی لہجے میں چیخنے لگی تھی، میں بوکھلا گیا، اسے چپ کروانا مشکل ہو گیا تھا۔

”تم ایسا سوچ سکتے ہو کیوں کہ تمہاری ماں تمہیں اپنے پاس سلا کر کہانیاں سنایا کرتی تھی اجنبی۔ تمہاری چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے دن بھر کام کرتی تھی، تم نے جس ماں کا روپ دیکھا ہے، میں نے اسے صرف قصے کہانیوں میں پڑھا ہے۔ مجھے ماں کی ممتا محسوس نہیں ہوتی ان کی آواز میں۔ وہ میرے لیے فاطمہ آنٹی سے کم تر ہیں۔ کم از کم فاطمہ آنٹی کی آواز میں اجنبیت کا احساس تو نہیں ہوتا اور میں تمہیں چھوڑ کر ان کے پاس کیوں جاؤں؟“

اس کے لفظ آخر میں بھگنے لگے اور آنکھیں جاری ہونے کو تھیں۔

”یا پھر کہہ دو کہ تم بھی تنگ آ گئے ہو ایک سر پھری پاگل لڑکی سے، تمہارا دل بھر گیا ہے مجھ سے۔“

میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سانس لی تھی۔

”میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔ آپ نہیں جانا چاہتیں اپنی ماما کے پاس؟ اوکے مت جائیے، مگر ان کے لیے دل میں اتنی بدگمانیاں مت پالیں میم صاب۔ آپ صرف یہ سوچتی

ہیں ایک ماں نے اپنی چار سال کی بچی کو بلکتا ہوا چھوڑ دیا۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتیں ایک ماں کی غلطی کے عوض اللہ نے پچھلے پندرہ سال سے ان کی بیٹی کو ان سے دور کر رکھا ہے؟ آپ بھلے مشکل میں رہی ہیں، مگر آپ کی ماما کی مطمئن زندگی کی گارنٹی بھی آپ کے پاس نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے اس آبلہ پائی میں ان کے پاؤں آپ سے زیادہ زخمی ہوں۔ وہ آپ کو آواز اور تصویر کی حد تک جانتی ہیں، آپ کو فون کرتی ہیں۔ آپ تو ان کا فون سننا بھی گوارا نہیں کرتیں۔ ان کی تصویریں بھی شاید آپ کی توجہ کو ترستی رہی ہوں گی۔ اب تک وہ غلطی کر کے سزا پانے کی مستحق اللہ کی عدالت میں بھی ٹھہری تھیں، مگر دنیا میں ان کو سزا دینے میں آپ نے بھی تو کوئی کسر نہیں چھوڑ رکھی۔ آپ بے گناہ ہو کر بھی ان سے یہ سوال نہیں کر سکتیں کہ ماما مجھے بتائیں میرا کیا قصور تھا؟ وہ گناہ گار ہو کر کیسے آپ سے نظریں ملا سکتی ہیں؟ آپ کو ایک بار پوچھنا چاہیے تھا۔ شاید ان کا جواب آپ کے دل میں ان کے لیے بدگمانیوں کی دھند ختم نہیں تو کم ضرور کر سکتا تھا۔ میں نے ابھی آپ سے کہا تھا، آپ انہیں معاف کر دیں اور آپ نے جھٹ سے حامی بھر لی۔ میں نے کیوں کہا تھا؟ کیوں کہ مجھے آپ کے ظرف پر کوئی شک نہیں تھا جو لڑکی اپنے باپ کے قصور کے لیے میرے جیسے کسی معمولی آدمی کی عدالت میں کھلے عام پیش ہو جاتی ہے۔ وہ کتنی اسپیشل ہو گی یہ میں آپ سے زیادہ

جانتا ہوں۔ آپ جتنا بھی غصہ کر لیں، جتنی نفرت دکھالیں۔ میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں آپ آج بھی اپنی ماما اور پاپا سے بے حد پیار کرتی ہیں۔

میں نے اس کی حالت کے پیش نظر حد درجہ نرمی سے اسے سمجھایا تھا اور وہ یک ٹک اپنے آنسو بھول کر مجھے تکے چلی جا رہی تھی۔

”پتا ہے تم میں خاص بات کیا ہے؟ تم میری پرچھائی سے مختلف سوچتے ہو۔ بالکل ایسے ہی جیسے میں سوچنا چاہتی ہوں، مگر اس کی باتیں سننے کی اتنی عادت ہو گئی ہے اب ہر جگہ وہی سہی لگتی ہے۔“

اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تھا، اس بار اس کے لہجے میں وہ شدت نہیں تھی، مجھے تھوڑا سا حوصلہ ہوا تھا۔

”آپ نے وہاں ہمیشہ کے لیے نہیں جانا، صرف کچھ دن کی بات ہے۔ آپ جب بھی واپس آئیں گی، میں آپ کو اسی پارک کے کسی اندھیرے کونے میں محو انتظار ملوں گا۔ میں آپ سے زیادہ اداس رہوں گا، مگر آپ کا ایک بار اپنی ماں سے مل کر آنا میری اور آپ کی اداسی سے زیادہ ضروری ہے۔ آپ ایک بار ان سے مل کر دیکھیے تو سہی ہو سکتا ہے زندگی سے شکایتوں میں کچھ کمی آجائے۔“

میں اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ جو دکھنے میں بہت ضدی لگتی تھی، باتوں سے ہٹ دھرم، لہجے سے پتھرلی، مگر میرا دل گواہی دیتا تھا کہ اس سے زیادہ خوبصورت دل اس شہر میں کسی کے پاس نہیں تھا۔ وہ خاموش ہو گئی تھی، میں جان گیا تھا اس خاموشی میں اس کی رضامندی چھپی ہوئی تھی۔

”اور جو کچھ تم سوچ رہے ہو ویسا نہ ہو سکا تو؟“

اس نے دل میں چھپے اندیشے کو زبان دی تھی۔

”تو آپ کے دل سے کم از کم ایک بوجھ کم ہو جائے گا کہ آپ نے پوری زندگی ان کی طرح انہیں اہمیت نہیں دی۔“

”تم مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے؟“

ایک اور خدشہ تھا کہ وہ مثبت کم ہی سوچتی تھی۔

”آپ کے تصور میں رہتے ہوئے میرا دن گزرتا ہے، میں خود کو بھول سکتا ہوں، مگر آپ کا خیال کبھی دل سے نہیں نکال سکتا۔ آپ نے مجھے اس شہر میں رہنے کی اصل وجہ دی ہے، آپ کی غیر موجودگی میں گزرا ہوا ایک ایک لمحہ آپ کی یادوں کا امین رہے گا۔“

”تمہیں گاؤں واپس جانا پڑ گیا تو؟“

وہ وسوسوں میں گھری ہوئی تھی۔

”تو آپ کے لیے پھر واپس آنا پڑ جائے گا۔“

میں نے اس کا یہ ڈر بھی دور کر دیا تھا۔

”میں صرف تمہارے کہنے پر جاؤں گی۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔“

وہ جتلا رہی تھی یا صرف بتا رہی تھی، میں سمجھ نہیں سکا، مگر میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ جانے کے لیے راضی ہو گئی تھی۔

”میں جانتا ہوں اور یہ بھی کہ آپ کا یہ فیصلہ آپ کے لیے نئی خوشیوں کا سبب بنے گا۔“

میں نے پر یقین لہجے میں کہا تھا۔

”میں اب بھی کہہ رہی ہوں اگر واپسی پر مجھے تم نہ ملے تو میں جی نہ پاؤں گی۔ تم میری سب سے قیمتی چیز بن گئے ہو اجنبی، میں نے پہلی بار کوئی رشتہ بنایا ہے۔ ایسا رشتہ جس میں میری زندگی کا سب کچھ چھپا ہے۔ اگر وہ ٹوٹ گیا تو میں ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاؤں گی۔“

وہ غم لہجے میں اپنی بے بسی کا اقرار کر رہی تھی اور میں اپنے اندر اٹھتے طوفان کو دبا کر بہ ظاہر مسکراتے ہوئے اسے یقین دلا رہا تھا کہ میں زندگی کی آخری سانس تک اس کا بن کے رہوں گا، وہ مان گئی تھی اور اب میرا دل مجھے کوس رہا تھا۔

”یہ میں نے کیا کر دیا، اسے خود سے دور بھیج دیا۔ اب میں کیسے رہ پاؤں گا اس کے بنا؟“

دل اور دماغ میں یہی فرق ہے۔ دل اپنا فائدہ سوچتا ہے، مگر نقصان کر بیٹھتا ہے۔ دماغ اپنی سوچ کی لہروں سے ہمیں زندگی کی سچائیاں بتاتا ہے اور سچ دیکھنے کے چکر میں ہم دل کو مار ڈالتے ہیں۔ میں بھی سچ دیکھنا چاہتا تھا اور سچ یہی تھا کہ وہ اور میں دریا کے دو کناروں کی طرح تھے جو کبھی آپس میں مل نہیں سکتے چاہے پورا دریا خشک ہو جائے۔ دل کہتا تھا تم جھوٹے ہو، سچ یہ ہے کہ تم اس لڑکی کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو چکے ہو جسے پہلی نظر میں تم نے پاگل سمجھا تھا۔ دماغ کہتا تھا جتنا اونچا اڑو گے، اتنی زیادہ شدت سے زمین پر گر دو گے۔ ابھی رک جاؤ، وقت اتنا بھی نہیں بیتا۔ میں نے دل و دماغ میں چلتی جنگ سے مجبور ہو کر اسے ماں سے ملنے کے لیے مجبور کیا تھا۔ میں خود بھی آزمانا چاہتا تھا حالاں کہ میں جانتا تھا کہ اس آزمائش میں، میں بری طرح فیل ہونے والا ہوں۔

ہماری ملاقاتیں رات بارہ بجے سے فجر کی اذانوں تک ہوتی تھیں۔ اس کے بعد وہ اپنے پیلس میں اور میں اپنی کٹیا میں گم ہو جایا کرتا تھا اور آنے والی رات کا سوچتے ہوئے ہم دونوں دن خوشی خوشی گزار لیا کرتے تھے۔

آج اس نے مجھے جدا ہونے کا عندیہ دے دیا تھا یا میں نے اس سے وصول کر لیا تھا آگے کیا ہونا تھا؟

یہ تو بس نیلا امبر تخلیق کرنے والا جانتا تھا۔

☆...☆...☆

بائیس جون بروز اتوار (2013ء)

اپنے شاندار آفس میں بیٹھ کر کافی پیتے ہوئے سیٹھ کریم لیپ ٹاپ سامنے سجائے مگن تھے جب ان کے موبائل فون پر بیپ ہوئی، لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹا کر انہوں نے ٹیبل پر پڑے فون کی طرف دیکھا۔ اسکرین پر ”کوئین“ لکھا ہوا دیکھ کر انہوں نے عجلت سے کافی کا مگ سائیڈ پر رکھا اور کال ریسیو کی۔

”ہیلو کوئین۔“ کہتے ہوئے ان کی آواز میں حیرت نمایاں تھی۔

”پاپا آپ آج ڈنر میرے ساتھ کر سکتے ہیں؟“

انہیں اپنی اکلوتی بیٹی کی آواز سنائی دی تھی۔ ویسی ہی بے تاثر، مگر آج کچھ نہ کچھ انوکھا بھی تھا اس میں۔

”بالکل کر سکتا ہوں بہ شرط یہ کہ آپ میرے آنے تک جاگ پائیں۔ ویسے میں جانتا ہوں

آپ مہران اسٹریٹ کے خالی ہونے تک جاگتی رہتی ہیں اور مہران اسٹریٹ پر سب سے آخر

میں آنے والی گاڑی آپ کے پاپا کی ہی تو ہوتی ہے۔“

بشاش لہجے میں بولتے ہوئے آخر میں ہنس پڑے تھے وہ۔

”میں آپ کا انتظار کروں گی۔“

اس نے کہا اور فون کاٹ دیا تھا۔

سیٹھ کریم نے اچانک خاموش ہو جانے والے فون کو دیکھا اور سائیڈ پر رکھ کے کافی کاگ اٹھا لیا تھا۔ کچھ دیر تک لیپ ٹاپ پر مصروف رہنے کے بعد انہوں نے انٹرکام پر کسی کو ہدایات دی تھیں اور جلدی جانے کا بتا کر پھر سے لیپ ٹاپ میں مگن ہو گئے تھے۔

اور آج کافی عرصے بعد کمال چاچا نے آٹھ بجے ان کی گاڑی کا ہارن سن کر حیرت سے دروازہ کھولا تھا۔

گاڑی پورچ میں کھڑی کرنے کے بعد وہ تیزی سے چلتے ہوئے لاؤنچ میں داخل ہوئے تھے۔

سامنے رانی بیٹھی حسب عادت ٹی وی دیکھنے میں مگن تھی۔

”ہائے کوئین۔“ کہہ کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئے تھے وہ۔

”ہائے پاپا۔“ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں۔ میں آپ کے لیے جلدی آیا ہوں ورنہ اچھا خاصا کام تھا آج آفس

میں۔“

وہ جتنا رہے تھے۔

”جانتی ہوں پاپا۔ کھانے کی ٹیبل پر بات ہوگی۔ ابھی آپ فریش ہو جائیں۔“

کہتی ہوئی وہ اوپر چلی گئی اور سیٹھ کریم کندھے اچکا کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد دونوں باپ بیٹی آمنے سامنے کھانے کی ٹیبل پر موجود تھے۔ سیٹھ کریم بار بار سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔

”پاپا ہم نے آخری بار کب ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔ کچھ یاد ہے آپ کو؟“

کھانا شروع کرتے ہوئے بہ ظاہر نارمل سے انداز میں پوچھا تھا اس نے۔

اور سیٹھ کریم کے سالن کے ڈونگے کی طرف بڑھتے ہاتھ پل بھر کے لیے رکے تھے۔

”آئی ایم سو سوری بیٹا۔ آپ جانتی ہیں نا آپ کے پاپا کتنے بڑی ہوتے ہیں۔ اب یہ بھی تو نہیں

ہو سکتا کہ ہماری کوئین پاپا کے انتظار میں سوکھ سوکھ کر دہلی ہوئی رہے۔ اس لیے پاپا چاہتے

ہیں کہ ان کی رانی اپنے وقت پر کھانا کھالیا کریں۔“

اسے بچوں کی طرح پچکار تے ہوئے وہ ماحول کو ایسے ہی نارمل رکھنا چاہتے تھے جو اکثر دونوں

کا آمناسا منا ہونے پر ذرا سی دیر میں تلخ ہو جاتا تھا۔

”آپ کو کیسے پتا چلتا ہے کہ میں وقت پر کھانا کھا لیتی ہوں؟“

اس کے سوال انہیں ہمیشہ سے عجیب لگتے تھے۔

”کیا مطلب بیٹا؟ اس گھر میں نوکروں کی کمی تو نہیں ہے جو مجھے ہر وقت آپ کی فکر ستاتی

رہے۔ اگر آپ کو کسی سے شکایت ہے تو بتائیے۔ میں ابھی اسے نکال باہر کرتا ہوں۔“

اور ان کا جواب سن کر وہ مسکرا دی تھی۔ کیا کچھ نہیں تھا اس مسکراہٹ میں۔ طنز، شکایت اور مایوسی... مسکراہٹ میں بھی مایوسیاں در آیا کرتی ہیں، پر یہ تو مسکرانے والے ہی جانتے ہیں۔ دیکھنے والوں کو وہ اکثر اوقات بس مسکراہٹ ہی لگتی ہے جیسے اس وقت سیٹھ کریم کو وہ صرف مسکراتی ہوئی رانی لگی تھی۔

”بس آپ یونہی مسکراتی رہا کریں۔ آپ کی مسکراہٹ میں آپ کے پاپا کی جان ہے۔“ مطمئن ہو کر کہتے ہوئے وہ کھانے کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

”آپ نے جواب نہیں دیا پاپا؟“

”کس بات کا؟“

بے دھیانی میں کہتے ہوئے وہ کھانا شروع کر چکے تھے۔ اس بات سے قطعی بے نیاز کہ ان کے شروع کرتے ہی اس نے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

”ہم نے آخری بار کب مل کر کھانا کھایا تھا؟“

وہ اپنا سوال دہرا رہی تھی۔

”بیٹا آپ کے پاپا کی یادداشت ان معاملات میں بہت کمزور ہے۔ دماغ میں بہت ساری ضروری چیزیں ہوتی ہیں، اس لیے چھوٹی چھوٹی باتوں کو یاد رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ویسے مجھے

لگتا ہے زیادہ عرصہ تو نہیں گزرا ہو گا۔ آپ کی سالگرہ کے بعد دو یا تین بار تو ہم لوگ اکٹھے ہو ہی چکے ہیں ڈنر پر۔“

روانی میں کہتے ہوئے وہ اس سے زیادہ کھانے کی ٹیبل کی طرف متوجہ تھے۔

”میں ہم دونوں کی بات نہیں کر رہی ہوں پاپا۔“

کچھ دیر تک انہیں بہ غور کھانا کھاتے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے کہا تھا۔

”تو پھر آپ کس کی بات کر رہی ہیں رانی؟“

وہ اب بھی کھانا کھاتے ہوئے ایسے ہی بے خیالی میں پوچھ رہے تھے۔

”ہم تینوں کی۔“

اس نے مختصر اگہا تھا۔

”تیسرا کون؟“

وہ ابھی تک اس کی باتوں پر غور کیے بغیر کھانا کھاتے ہوئے جواب دیتے چلے جا رہے تھے۔

”اما“...

اور اس ایک لفظ نے پانی پیتے ہوئے سیٹھ کریم کو کھانسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پانی کا گلاس ٹیبل پر رکھ کر غور سے دیکھا تھا اس بار اپنی رانی کو انہوں نے اور اس کی خالی پلیٹ دیکھ کر اور بھی حیران ہو گئے تھے۔

”آپ نے ابھی تک کھانا شروع نہیں کیا؟“ حیرت سے پوچھتے ہوئے وہ اسے دیکھ رہے تھے۔

”آپ میری بات کا جواب دیجیے پاپا... میں، آپ اور ماما۔ ہم تینوں نے آخری بار کب ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا تھا؟“

اس کی آواز اونچی اور لہجہ سخت ہو گیا تھا۔

”آپ کو اچانک کیا ہو جاتا ہے رانی۔ یہ طریقہ ہے پاپا سے بات کرنے کا؟ ایک بے تکی سے بات کو لے کر آپ بحث پر اتر آتی ہیں۔ پندرہ سال ہو گئے آپ کی ماما کو گئے ہوئے، میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ ہم نے آخری بار کھانا کب کھایا تھا اور آپ اس وقت ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کی قابل نہیں ہوئی تھیں۔ صرف چار سال کی تھیں آپ؟“

شدید غصے میں کہتے ہوئے چیخ زور سے پلیٹ میں چٹا تھا انہوں نے۔

”یہی سننا چاہتی تھی میں پاپا کہ جب میں آپ دونوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کے قابل بھی نہیں ہو سکی تھی۔ تب آپ نے ماما کو جانے کیوں دیا، روک کیوں نہیں انہیں؟ پوچھا کیوں نہیں ان سے کہ میرا کیا بنے گا؟ میں تو کسی لائق بھی نہیں تھی۔ چل پھر نہیں سکتی تھی، بول نہیں سکتی تھی۔ مجھے ان کی ضرورت تھی ناپا پاپا تب آپ نے انہیں کیوں جانے دیا؟“ وہ چلا اٹھی تھی۔

سیٹھ کریم بیٹی کا یہ روپ دیکھ کر سکتے میں آگئے تھے اور جب سکتہ ٹوٹا تو شدید غصے نے جگہ لے لی۔

”مطلب کیا ہے تمہارا اس بات سے؟ تم یہ ثابت کر رہی ہو کہ میں تمہاری پرورش ٹھیک سے نہیں کر پایا۔ اس لیے تم پانچلوں جیسی حرکتیں کرتی ہو؟ کیا کمی دی ہے میں نے تمہیں۔ زندگی کا ہر عیش و آرام ہے تمہارے پاس، تمہارے ایک اشارے کے منتظر رہتے ہیں اس گھر کے سارے نوکر اور کیا چاہیے تھا تمہیں؟ جو صرف وہ خود غرض عورت دے سکتی تھی؟ ایسی کیا کمی رہ گئی ہے تمہاری زندگی میں جو تم یوں میرے سامنے اپنی ماں کو لا کر مجھے نیچا دکھانا چاہتی ہو۔“

کرسی پیچھے دھکیل کر وہ کھڑے ہو گئے تھے۔ ہمیشہ اسے آپ کہہ کر بلانے والے سیٹھ کریم آج کف اڑا رہے تھے۔ اس نے ماما کا ذکر کر کے انہیں چڑا ہی ڈالا تھا۔

”میں آپ کو نیچا نہیں دکھا رہی پاپا۔ آئینہ دکھا رہی ہوں، میرے معاملے میں اگر ماما خود غرض نکلیں، تو آپ بھی کچھ کم نہیں نکلے۔ آپ نے صرف میری ضرورتوں کا خیال رکھا ہے پاپا۔ میرا خیال آج تک نہیں آیا آپ کو... میں کیسے جینا چاہتی ہوں آپ نہیں جانتے۔ آپ کی پہلی ترجیح میں کبھی بھی نہیں رہی۔ آپ کا بزنس، آپ کی دوستیاں اور پارٹیاں رہی ہیں پاپا۔ آپ میں اور ماما میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ماما نے صرف اپنی زندگی کا سوچا اور آپ

نے اپنی زندگی کا۔ مجھ سے آپ دونوں کو کوئی مطلب ہی نہیں رہا۔ اس سے بہتر تھا آپ مجھے کسی یتیم خانے میں بھیج دیتے۔ کم از کم آپ کے ہوتے ہوئے خود ترسیکا شکار تو نہیں ہوتی۔” وہ ان کے سامنے تن کر کھڑی تھی اور حلق پھاڑ پھاڑ کے چلا رہی تھی۔ سیٹھ کریم کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ ان کے سامنے آج تک اس لہجے میں کسی نے بات نہیں کی تھی۔

”آپ صرف ایک اچھے بزنس مین ہیں پاپا۔ آپ ایک مادہ پرست انسان ہیں جو انسانی رشتوں اور جذباتوں کو دولت اور روپے پیسے میں تول کر جیتا ہے۔ آپ اچھے باپ نہیں ہیں۔ آپ اچھے شوہر نہیں ہیں اور میں یقین سے کہہ سکتی ہوں آپ اچھے بیٹے بھی۔“

”بکواس بند کرو رانیہ... اپنی حد میں رہنا سیکھو۔ تمہاری اس بد تمیزی پر میرا ہاتھ بھی اٹھ سکتا ہے، مگر یہ پہلی بار ہے۔ اس لیے چھوڑ رہا ہوں۔ آئندہ محتاط رہنا۔“

غصے اور ضبط کی انتہا پر کھڑے سیٹھ کریم پھر کر بولے تھے، مگر اس پر خاک اثر نہ ہوا تھا۔

”یہ بھی کر کے دیکھ لیں پاپا۔ مجھے بھی تھپڑ مار دیں جیسے اس گھر میں برسوں سے کام کرنے والے وفادار لوگوں کو مار دیتے ہیں، جیسے سڑک پر چلتے ہوئے عام لوگوں کو بلاوجہ پیٹتے ہیں تو میں کیوں نہیں؟“

وہ تیر کی طرح اڑتی ہوئی سیدھی ان کی ناک کے نیچے آکھڑی ہوئی تھی۔

سیٹھ کریم گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے تھے۔ اس لمحے انہیں اپنی بیٹی کی آنکھوں سے چھلکتی دیوانگی دیکھ کر خوف سا آگیا تھا۔

”مارئے ناپاپا... رک کیوں گئے آپ۔ یہ شوق بھی پورا کر لیجیے۔ یقین کیجیے مجھے ذرا بھی دکھ نہیں ہو گا۔ میں نے آپ کے اندر چھپے ہوئے بے حس آدمی کو برسوں پہلے دیکھ لیا تھا۔“

وہ ہذیبی انداز میں چیخ رہی تھی۔ کریم پیلس میں آج بھونچال آیا ہوا تھا۔ گھر کے تمام ملازمین دنگ تھے، چپ چاپ اور لیے دیئے رہنے والی رانی آج گلا پھاڑ کر چیخ رہی تھی اور اس کے سامنے سیٹھ کریم تھے جنہیں دیکھ کر ہی سب کی سیٹی گم ہو جاتی تھی۔

”تم اس وقت غصے میں ہو، تم خود بھی نہیں جانتی تمہارے منہ سے کیا کچھ نکل رہا ہے۔ جاؤ اپنے کمرے میں آرام کرو، کل صبح بات ہوگی۔“

اس بار وہ قدرے نرم اور سنبھلے ہوئے لہجے میں بول رہے تھے۔ گھر کے ملازمین کے سامنے مزید سبکی سے بچنے کے لیے انہوں نے بات ختم کرنے کی کوشش کی تھی، مگر رانی کو یہ منظور نہ تھا۔

”میں جانتی ہوں پاپا، بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ میرے منہ سے کیا نکل رہا ہے، مگر آپ آج بھی نہیں جانتے کہ میرے منہ سے یہ سب کچھ کیوں نکل رہا ہے؟ آپ مجھے نفسیاتی

مریض سمجھتے ہیں۔ آپ نے ماما کو بھی نفسیاتی مریض سمجھا ہو گا، تبھی وہ آپ کو چھوڑ کر چلی گئیں۔ سچ کیا ہے پایا؟ سچ یہ ہے کہ آپ خود ایک نفسیاتی مریض۔

”چٹاخ“...

ان کے ضبط کا بندھن ٹوٹ چکا تھا اور دوسرے پل کریم پیلس کے درو دیوار اس گھر میں رانیوں کی طرح پلنے والی رانی کے منہ پر پڑتا تھپڑ دیکھ کر ہل گئے تھے۔ سیٹھ کریم نے طیش میں آکر آج اس کے ساتھ بھی وہی کر دیا تھا جیسے وہ دوسروں کے ساتھ کرتے تھے۔ فرق مٹا ڈالا تھا انہوں نے۔

گال پر ہاتھ رکھ سکتے میں کھڑی رانی کو وہیں جما ہوا چھوڑ کر اسے انگلی سے وارن کرتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ کچن میں کھڑی فاطمہ اور باہر گاڑی دھوتا ہوا اکبر سہا ہوا تھا۔

”آپ کیا جانیں تذلیل کا احساس کیسا ہوتا ہے۔ کبھی بھرے بازار میں آپ کے منہ پر تھپڑ پڑے تو آپ کو پتا چلے۔“

کسی کا کہا ہوا فقرہ اس کے کانوں میں گونج اٹھا تھا۔

تذلیل کا احساس۔

کس کو زیادہ ہو گا؟

ایک راہ چلتے لڑکے کو کسی بگڑے ہوئے رئیس کی وجہ سے بھرے بازار میں منہ پر تھپڑ پڑنے پر؟

یا ایک بیٹی کو بے حس باپ کے ہاتھوں گھر کے ملازموں کے سامنے پٹنے پر؟

دل ہی دل میں حساب کتاب کرتی وہ ٹوٹے ہوئے قدموں سے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی، بہتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ۔

☆...☆...☆

تینیس جون بروز سوموار (2013ء)

میں جب سے آیا تھا، اسے مسلسل زار و زار روتے دیکھ رہا تھا۔ اسے مجھ سے شکایت تھی جو میں نے اسے ماں کے پاس جانے کے لیے راضی کیا تھا تاکہ وہ ایک بار ان کے سامنے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے سوال کر سکے۔ گلے شکوے کر کے من ہلکا کر سکے، وہ مان گئی تھی، مگر جانے کیوں وہی گلہ اس نے اپنے باپ سے کر دیا تھا اور اس کا انجام کیا ہوا۔ یہ جان کر میں اندر تک ہل گیا تھا۔ ایک باپ اتنا سخت دل کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ سگی بیٹی سے اتنا تعلق کیسے رہ سکتا ہے کہ اس کی باتوں کو، اس کے شکوؤں کو بھی سمجھ نہ پائے۔ اسے ماں

سے محروم کرنے کے بعد پچھلے پندرہ سالوں میں بیٹی کے لیے پندرہ گھنٹے نہ نکال پایا تھا وہ۔ پھر بھی اسے سمجھ نہیں پارہا تھا، اپنے ہوتے ہوئے اپنے ہونے کا احساس نہیں دلا پایا تھا اسے اور پوچھ رہا تھا کون سی کمی رہ گئی اس کی زندگی میں۔ مجھے اس رات اسے خون کے آنسو روتے ہوئے دیکھ کر ترس آیا... بے پناہ ترس۔ وہ کیا محسوس کر رہی تھی میں نہیں جان سکتا تھا۔ مجھے میرے باپ نے سخت غصے میں بھی پیار ہی پیار کیا تھا۔ میں اپنی ماں کی آنکھوں کا تارا تھا۔ کیسے سمجھ پاتا اس کو، جتنا سمجھ پایا تھا، اتنا ہی حیرت زدہ بھی تھا۔ میں اسے جلد از جلد مکمل دیکھنا چاہتا تھا۔ مکمل؟ مکمل صرف اللہ کی ذات ہے۔ جانے کیوں ہم انسان اس دنیا میں مکمل رہ کر جینا چاہتے ہیں۔ جانتے ہوئے بھی کہ مکمل جینے کے لیے مکمل زندگی چاہیے۔ مکمل زندگی کسے ملتی ہے اس دنیا میں؟ موت پچھاڑ دیتی ہے ہر بار حیات جاتی ہے زندگی سے۔ پھر بھی ہم مکمل جینا چاہتے ہیں۔ پورے لوازمات کے ساتھ... میں اسے کہانیوں کی شہزادی کی طرح خوش باش دیکھنا چاہتا تھا اور وہ ہر گزرتے دن حسرت و یاس کی تصویر بنتی جا رہی تھی۔ پہلے کسی کے سامنے آنسو نہیں بہا سکتی تھی، اب میرے سامنے اس کے آنسو تھمتے نہیں تھے۔ میں خود پر قابو رکھ کر اسے حوصلہ دیا کرتا اور میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس کی مشکلیں میں حل نہیں کر سکتا تھا اور وہ مجھے بتائے بنا رہ نہیں سکتی تھی۔ میں اس دن بھی اسے لاچاری سے روتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور دل مسوس رہا تھا۔ کسی طرح اس کے سارے دکھ خرید لینا

چاہتا تھا، پر دکھ وہ واحد اثاثہ ہے جس کی ملکیت بن جائے اسی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں نے بکھری ہوئی لڑکی کو بازوؤں سے سمیٹ کر اپنے قریب بیٹھایا تھا اور لڑکھڑاتی آواز میں اسے تسلی دینی چاہی تھی۔

”مت روئیں آپ، خدا کے لیے چپ کر جائیں۔ وہ کوئی غیر نہیں آپ کے پاپا ہیں۔“
 ”نہیں... میرے لیے سب غیر ہیں۔ میں جانتی تھی، مگر تم نے مجھے مجبور کر دیا۔ تمہاری وجہ سے آج میرا ہاسبا بھرم بھی ٹوٹ گیا۔ میں نے ان سے شکوے شکایتیں کبھی نہیں کیں۔ میں جانتی تھی ان کی نظروں میں میری وقعت کیا ہے۔“
 وہ بری طرح چیخ کر بولی تھی۔

”کیا اب بھی تم چاہتے ہو کہ میں ماما کے پاس جاؤں۔ تمہاری غلط فہمی دور کرنے؟“
 میں خالی نظروں سے ہونٹ کاٹتے ہوئے آنسو پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے آنسو مجھ پر اثر کرتے تھے۔

”میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے، تم بھی چلے جاؤ یہاں سے۔“
 مجھے پرے دھکیلتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

میں چپ چاپ اس کی باتیں سنتا جا رہا تھا۔ میرے پاس اسے کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ اس کے باپ نے میری ساری غلط فہمیاں دور کر دی تھیں۔ یہ کچھ اگر اس کی ماں نے بھی کر دیا، تو وہ واپس آنے کے بجائے وہیں مرنا پسند کرے گی۔

کافی دیر تک آنسو بہا لینے کے بعد وہ چپ ہوئی، مگر اس کی سسکیاں اب بھی جاری تھیں۔

”اگر تم کہہ... تے ہو... تو... وہیں ماما۔“

وہ سسکیاں لیتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔ میں نے اپنی پوری توانائیاں خرچ کر کے خود کو اس سے دور رکھا ہوا تھا۔ شدت جذبات سے میرا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ میں اس کی حالت نہیں دیکھ سکتا تھا اور رندھے ہوئے لہجے میں بس یہی کہہ سکتا تھا۔

”میں آج کے بعد آپ کو کبھی کسی بات کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔ میں آپ کو ہر قسم سے آزاد کرتا ہوں میم صاب۔ آپ جو کہیں گی میں وہ کر گزروں گا۔ میرے لیے آپ کی خوشی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ میں آپ کو اس طرح بلکتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، آپ کی سسکیاں مجھے مار ڈالیں گی۔ میں آپ سے بے حد پیار کرتا ہوں، آپ وہی کریں جو آپ کرنا چاہتی ہیں۔“

”میں ایک بار ماما کے پاس جاؤں گی۔“

اس کی سسکیوں میں کمی آئی تو اس نے چہرے کو ہاتھوں سے رگڑتے ہوئے کہا تھا۔

”میں تمہارے ساتھ زندگی کا بقیہ سفر شروع کرنے سے پہلے دل میں کوئی ملال نہیں رکھنا چاہتی اجنبی۔ تم نے کبھی سوچا ہے میں تمہیں اپنا نام کیوں نہیں بتاتی؟ کبھی تمہارا نام کیوں نہیں پوچھتی؟ تمہیں اجنبی کیوں کہتی ہوں؟ مجھے ڈر لگتا ہے کہیں تمہیں تمہارے نام سے پکارنا شروع کروں اور تم مجھے میرے نام سے... تب تم بھی اسی طرح پکارا کرو گے نا جیسے پاپا پکارتے ہیں؟ میں ایسا نہیں چاہتی۔ مجھے خوف آتا ہے جب کوئی پیار سے مجھے میرے نام سے پکارتا ہے۔ اس کا پیار صرف دھوکا ہوتا ہے۔ جیسے میری ماں پکارتی ہے۔ مجھے دھوکا دیتی ہے۔ میں اس دھوکے کو یقین میں بدل کر یہاں صرف تمہارے لیے لوٹوں گی اجنبی۔ جب اس دنیا میں میرا نام پکارنے کا حق کسی کے پاس باقی نہیں رہے گا۔ تب تمہیں اپنے نام سے پکارنے کی اجازت دوں گی۔ تب تمہیں اجنبی نہیں کہوں گی۔ تم میرا انتظار کرنا، اس اعتبار کے ساتھ کہ میرے زندہ رہنے کا جواز اب تم ہی ہو۔“

کہتے ہوئے وہ اس جواری کے مانند لگ رہی تھی جو مسلسل ہارنے کے بعد اب اپنی زندگی کا آخری داؤ کھیلنے جا رہا ہو۔

میں نے اقرار میں سر ہلا دیا تھا، مجھے بس یہی کرنا تھا آج کے بعد۔

اکتیس دسمبر بروز ہفتہ (2013ء)

اور وہ چلی گئی تھی۔

اسے گئے مہینوں گزر چکے تھے۔ موسم بدل چکا تھا، وقت بھی بدل چکا تھا مگر میں اب بھی جون کی راتوں میں جی رہا تھا جو میں نے اس کی سنگت میں کاٹی تھیں۔ میری وہی روٹین تھی، وہی شب و روز تھے۔ وہی مرتضیٰ تھا اور اس کی وہی چلی کٹی باتیں، وہی چھوٹو تھا اور اس کی وہی مسکراہٹیں اور چھوٹی چھوٹی معصوم باتیں۔ وہی کریم پیلس اور اس کی خوبصورت جنگلے میں قید چھت تھی۔ بس اب اس کا ایک کونہ بہت اداس دکھتا تھا۔ میری طرح... شاید وہ بھی اس کے انتظار میں جل رہا تھا۔ وہی پارک، وہی خاردار لوہے کی تار کی بنی ہوئی باڑھ اور اس کے اندر بنا ہوا سیمنٹ کا بیج... میں اب بھی رات کے بارہ بجے وہاں جا کر بیٹھتا تھا اور چھت کے اس کونے کو دیکھتے ہوئے اس کی باتوں میں اور اس کی یادوں میں کھویا رہتا تھا۔ مجھے سب یاد تھا، اس کا ہنسنا، اس کا رونا، اس کی اداسیاں اور اس کی ناراضیاں۔ ابھی کل ہی کی بات تو تھی جب وہ پہلی بار کچے پکے راستے کے اس پار بنے ہوئے محل کی چھت سے مجھے دیکھ کر میرے پاس آئی تھی اور میں ہمیشہ کے لیے اس کا ہو گیا تھا۔ اور وہ 'وہ تو میرا انتظار کرتی رہی تھی۔ برسوں سے 'تو کیا ہوا اگر اس بار میں انتظار کی سولی پر لٹک گیا تھا۔ اسے تو آنا تھا۔ اگر

جینا تھا تو آنا ہی تھا اور میرے پاس آنے کے علاوہ وہ کہاں جاسکتی تھی۔ میں اس کی سانسوں کا تسلسل تھا، وہ کیسے میرے بنارہتی ہوگی۔ یہی سوچ اس کے انتظار کو اور بھی سہل بنا دیتی تھی۔ آج سال کا آخری دن تھا جو گزر چکا تھا۔ دنیا جشن منارہی تھی، قیامت آنے میں ایک سال کم ہو گیا تھا۔ بے خبر انسان قیامت کے قرب کی خوشیاں منارہا تھا۔ وقفے وقفے سے آتی ہوئی فائرنگ کی آواز اور مہران اسٹریٹ پر بارہ بجے اچانک لگ جانے والا موٹر سائیکلوں اور کاروں کا ہجوم بتاتا تھا کہ انسان کتنی بے چینی سے قیامت کا انتظار کر رہا ہے۔ پیپی نیو ایر کہہ کر ایک دوسرے کو مبارکباد دینے والے، نئے سال کی خوشیوں میں مگن تھے اور میں اسی طرح چپ چاپ چھت کے اس کونے کو تک رہا تھا جہاں کبھی ایک مدہم سا اداس اور بے چین ہیولا نظر آتا تھا۔ چھت کا وہ کونہ کتنا سونا لگتا تھا اس کے بغیر...

”آج وہ بھی نئے سال کی آمد منارہی ہوگی؟“

میں نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔

اور جو اس وقت وہ میرے پاس یہاں ہوتی، تو نئے سال کا آغاز کتنا خوبصورت ہو جاتا۔

آغاز تو ہو چکا تھا۔

اور اس آغاز کے ساتھ ہی میری آنکھوں کو دھوکا سا ہوا۔

آج مہینوں بعد اس چھت پر پھر کوئی ہیولا آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

میں بے اختیار اُچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میری آنکھوں میں ایک تیز چمک ابھری تھی۔ میں نے ایک قدم باڑھ کی طرف بڑھتے ہوئے مبہم ہیولے کو غور سے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کی تھی۔

یہ وہی تھی...

وہی جس کے جینے کی وجہ میں تھا۔ صرف میں...

مگر یہ اس وقت وہاں کیا کر رہی تھی؟ اسے میرے پاس ہونا چاہیے تھا یہاں۔

میں بے چین ہو کر اُٹھا تھا۔ کاش اس گھر کے دروازے میرے ایسے کسی اجنبی کے لیے کھل سکتے تو میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس گھر کی چھت کے اس خوش قسمت کونے پر جا پہنچتا جسے اس کا دیدار مجھ سے پہلے نصیب ہوا تھا جس کا طویل انتظار مجھ سے پہلے ختم ہوا تھا۔ مجھے چھت کے اس کونے پر رشک بھی آیا اور حسد بھی۔ کیا قسمت پائی تھی اس نے۔ نئے سال کے پہلے لمحے اس کے حصے میں آئے تھے۔

میں نے ایک قدم اور بڑھایا۔ شاید وہ اس طرف دیکھے، شاید اسے بھی کوئی مبہم ساسا یہ نظر آجائے جو شوق دیدار کی آگ میں جلتے جلتے مجلس چکا تھا، مگر وہاں آج بے نیازی ہی بے نیازی تھی۔ اس نے ایک بار بھی اس طرف دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

میں نے ڈوبتے ہوئے دل سے سوچا تھا۔ اسے سب سے پہلے اسی طرف تو دیکھنا تھا، جہاں اس کا واحد اپنا اس کے لیے آنکھیں بچھائے بیٹھا تھا۔

اور پھر ایک انہونی ہو گئی۔

آج اس کے ساتھ ایک اور سراپا بھی نظر آنے لگا تھا۔ اس سے تھوڑا سا لمبا دیکھنے والا جس نے آتے ہی اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر اس کے ماتھے کا بوسہ لیا تھا اور اس کے بالکل ساتھ کھڑا ہو گیا تھا۔

”یہ کون ہو سکتا ہے؟“

میں نے دل کی بے لگام ہوتی دھڑکن کو سنبھالتے ہوئے سوچا تھا۔

”شاید اس کا باپ۔ سیٹھ کریم، تو کیا آج انہونیوں کا دن ہے؟“

وہ ٹریفک دیکھ رہی تھی اور وہ اس سے لگ کر کھڑا تھا سے دور دور تک اشارے کیے چلا جا رہا تھا۔

میں واپس آ کر بیچ پر بیٹھ گیا تھا۔ میرے پاؤں میرا وزن اٹھانے سے انکاری ہونے لگے تھے۔

اس کی بے رخی دیکھ کر میرے دل کو عجیب سے ہول اٹھنا شروع ہو گئے تھے۔

”کیا وہ مجھے بھلا سکتی ہے؟“

میری سوچ میں بے یقینی سے زیادہ بے قراری تھی۔

”نہیں... نہیں... ایسا نہیں ہو سکتا۔“

کوئی زور زور سے میرے اندر بول رہا تھا۔

تو پھر وہ مجھ سے اتنی بے نیاز ہو کر کیسے کھڑی رہ سکتی ہے؟ مجھ سے انجان بن کر کیسے رہ سکتی ہے، مجھے نظر انداز کر کے سانس کیسے لے سکتی ہے؟

اس کے سارے دعوے اور قسمیں...

کیا ہوا ان سب کا۔

میں سوچ سوچ کر پاگل سا ہونے لگا تھا۔

وہ کچھ دیر دوسرے سائے کے ساتھ کھڑی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی میری نظروں سے غائب ہو گئی اور وہ نیا سراپا جانے کون تھا وہ اس کے جانے کے بعد کچھ دیر تک یونہی ادھر ادھر دیکھتا رہا اور یونہی دیکھتے دیکھتے اس کی نظر مجھ پر آن لگی اور پھر مجھے لگا جیسے اس نے ہاتھ ہلایا ہو۔ نئے سال کی مبارکباد دینے کے لیے، قرب قیامت کی خوشی بانٹنے کے لیے، مگر میں جوابی ہاتھ نہ ہلا سکا تھا۔ میرے لیے تو آج ہی قیامت آچکی تھی۔ اس کا ہاتھ ہلا کر خیر سگالی کا مظاہرہ چیخ چیخ کر مجھے کہہ رہا تھا وہ سیٹھ کریم نہیں کوئی اور تھا۔

کوئی اور...؟

اس کی زندگی میں کوئی اور کون ہو سکتا تھا؟

وہ ماں سے ملنے کینیڈا گئی تھی اور وہاں سے کوئی اور بھی اس کے ساتھ چلا آیا تھا اور اس کے اتنا قریب تھا کہ اس کے ماتھے کا بوسہ لینے کی جرأت بھی کر سکتا تھا۔ ان دیکھے اندیشوں اور وسوسوں کے ناگ پھن پھیلا کر میرے سامنے آکھڑے ہوئے تھے۔

کوئی اور...

اس کی زندگی میں کوئی اور تو کوئی شہزادہ ہی ہو سکتا تھا۔

تو کیا وہ وقت آچکا تھا جسے لاتے لاتے میں خود ہی بھول گیا تھا۔ شہزادے نے تو آنا ہی تھا ایک نہ ایک دن۔ کہانی مکمل کیسے ہوتی، اگر شہزادہ نہ آتا تو؟

سوچ کا ایک اور درواہا تھا۔

”پرویز گل صاحب! اسے کینیڈا میں وہ شہزادہ مل چکا ہے جسے اس سے ملانے کے خواب آپ دیکھا کرتے تھے۔ یاد ہے نا آپ کو اپنی اوقات... اس کہانی میں اپنا کردار... کیا ہے آپ کا کردار؟ ایک معمولی لکڑہارے کا جسے قسمت سے شہزادی مل جاتی ہے۔ پھر ایک شہزادہ آتا ہے اور اس شہزادی کو آپ سے چرا کر لے جاتا ہے اور شہزادی بھی خوشی خوشی اس کے ساتھ چلی جاتی ہے، کیوں کہ آپ کی کہانیوں میں غم کا تو ذکر ہی نہیں ہوتا۔ آپ بھی تو پیپی اینڈنگ چاہتے ہیں ہر کہانی کا... تو پھر خوش ہو جائیے نا۔ آپ کی کہانی کا اختتام آپ کی مرضی کے مطابق جو ہو رہا ہے اب ملال کیسا؟ کہیں لکڑہارے سے ہمدردی تو نہیں ہو گئی آپ کو؟ تو

کیا ہوا؟ لکڑہارے کی ہمدردی کے بجائے شہزادی کی خوشیوں کا سوچے۔ زندگی میں پہلی بار چھت کے اس کونے پر کوئی شہزادہ اس کے ساتھ کھڑا ہونے کے لیے آیا ہے۔ آپ اپنے حصے کا کردار نبھائیے اور چپ چاپ شہزادی کی خوشیوں کا جشن منائیے۔

میں نے تھک ہار کر سر جھکا لیا تھا۔ چھت پر اب کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ وہ جس کے انتظار میں ان گنت رت جگوں کا شکار ہوا تھا اور نہ وہ جس سے ہار کر مجھے شہزادی کی جیت کا جشن منانا تھا۔

رات گزر گئی تھی اور نئے سال کے پہلے دن دو بجے اس کا ہلکا سا دیدار نصیب ہوا تھا۔ جب وہ کالے رنگ کی سیڈان میں بیٹھ کر چھپر ہوٹل کے سامنے سے زن سے گزر گئی تھی اور ساتھ میں ایک خوبصورت کینیڈین شہزادہ بھی بیٹھا ہوا تھا۔

”اوائے چھو کرے... ادھر خیال کر۔ لڑکیاں مت تاڑ... یہاں دیکھ، چائے گرتے گرتے پچی ہے۔“

کسی نے درشت لہجے میں کہتے ہوئے مجھے ٹوکا تھا۔

اور میں...

جس نے ایک لڑکی کے مکمل ہو جانے کی دعا کی تھی۔ ایک شہزادی کو اس کے شہزادے سے ملنے کی دعا کی تھی۔ اس کے پورے ہونے کے باوجود اندر سے دھیرے دھیرے ٹوٹ رہا تھا۔ اتنے مہینوں بعد آج پھر کسی کا ”اوائے چھو کرے“ کہنا سخت برا لگا تھا مجھے۔

☆...☆...☆

دو جنوری بروز سوموار (2014ء)

میں کل رات بارہ بجے تک خود سے لڑتا رہا اور خود کو قائل کرتا رہا تھا کہ مجھے آج کے بعد مرتضیٰ کی اس کٹیا میں رات دس بجے سو جانا ہے۔ کریم پیلس، اس کے سامنے بنا ہوا چھوٹا سا پارک اور پارک کی اس بنچ سے اپنا تعلق ختم کر دینا ہے۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا۔ آئندہ کریم پیلس کی اس شہزادی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا اور اگر اس سے آئنا سامنا ہو بھی گیا تو کسی اجنبی کی طرح نظریں پھیر کر گزر جاؤں گا۔ دس بجے ہوٹل بند ہو جانے کے بعد بارہ بجے تک کٹیا کے اندر زمین پر لیٹا میں مرتضیٰ کے خراٹے سنتا رہا اور سونے کی ناکام کوشش کرتا رہا تھا۔ اس کی یادوں کو بھگانے کے لیے بار بار کروٹ بدل رہا تھا اور اس کا صبح

چہرہ بھلانے کے لیے بار بار آنکھیں جھپک رہا تھا۔ آنکھیں بند ہوتیں تھیں اور وہ جھٹ سے سامنے آ جاتی تھی۔

کبھی گاڑی کے ادھ کھلے دروازے میں کھڑی چائے پیتی ہوئی، جسے وہ بد مزہ چائے کہتی تھی۔ کبھی اپنے گھر کے سامنے، بیچ راستے میں روک کر مجھے دو موتیوں کا تحفہ دیتی ہوئی۔ دو قیمتی موتی جو صرف میرے لیے تھے۔

کبھی پارک کی گھاس پر چل کر ہنسی بکھیرتی ہوئی۔

کبھی اپنوں کی زیادتیوں کے قصے سنا کر روتی ہوئی، سسکتی ہوئی، ہچکیاں لے لے کر مچلتی ہوئی۔

اور پھر اس رات، جب وہ ٹوٹ کر روئی تھی جیسے آج آخری بار رونا ہے۔ میرے سامنے... آخری بار ہی تو تھا۔ اس کے بعد میری آنکھیں ترس گئی تھیں۔ ان موتیوں بھری سرخ آنکھوں میں جھانکنے کے لیے۔

میں بارہ بجے تک سو نہیں پایا تھا۔

کیسے سو پاتا؟ عادت جو نہیں تھی۔ فجر کی اذان سے پہلے سونے کی۔ اسے دیکھے بغیر، اسے سوچے بغیر میں کیسے سو پاتا؟

بارہ بجے ہار گیا تھا میں۔ میرے قدم خود بخود ہی پارک کی طرف چل پڑے تھے، جیسے انہیں میری کوئی پروا نہ ہو۔ بس وہی کرنا ہو جو اس شہر میں پہلے دن سے لے کر آج تک کرتے آئے تھے۔ دل اداس تھا، مگر امید اب بھی باقی تھی۔ کیا پتا ایک بار... ایک آخری بار مجھے الوداع کہنے کے لیے ہی آجائے۔ لوہے کی تار کی بنی ہوئی باڑھ شروع ہو چکی تھی۔ میں اس بیچ کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ دل نے کہا بیٹھ کر ایک رات اور گزار دو شاید مجھے قرار آجائے۔ دل کو کون سمجھاتا؟ قرار کیسے آ سکتا ہے، شکایتیں جو پیدا ہونے لگی ہیں اسے۔ ہمیشہ میری مرضی سے چلتا تھا۔ آج اپنی چلانے پر بضد لگ رہا تھا۔ میں نے باڑھ کر اس کی اور بیٹھ کر خاموشی سے دل کی شکایتیں سننے لگا اور کچھ کرنے کے لیے تھا بھی نہیں۔ دل کہتا تھا اس نے وعدہ کیا تھا پورا کرنا چاہیے۔ پورا نہ کرتی تو یوں نظر انداز تو نہ کرتی۔ گلہ کرنے کا حق تو دیتی۔ بھلے میں اس حق کو کبھی استعمال نہ کرتا۔ ایک بار سامنے تو آتی مجھے اپنی خوشیوں میں شریک تو کرتی۔ میں تو اس کے غموں کا امین تھا۔ اس کا راز دار... وہ کہتی تھی میں اس کا دوست ہوں۔ پہلا دوست، تو ایک دوست کے ناتے ہی ایک بار آ جاتی۔ یاد وہ بھول گئی سب رشتوں کو جو اس نے ایک ہی دن میں ایک ہی شخص سے بنا ڈالے تھے اور جسے جینے کی وجہ قرار دیا تھا۔

تو اتنی بے اعتنائی کیوں؟

میں تو جانتا تھا میں اس کا ہوں۔ سمجھتا تھا وہ میری ہے، مگر میری بن کر ساری عمر میرے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ میں اسے دل میں بسا سکتا تھا، اپنے کچے گھر کے تنگ و تاریک کمرے میں نہیں۔ میں سب جانتا تھا، مانتا تھا۔ بنا اس کے کہے، مگر یوں نظر انداز کیا جانا بھی برداشت نہیں ہو رہا تھا، کیونکہ برداشت ہوتا۔ اس نے مجھے اندھے اعتبار کی وہ عینک جو پہنا دی تھی جس میں صرف وہ اور اس کی باتیں ہی نظر آتی تھیں۔ گزرے دن میں اس کے ایک پل کے دیدار نے شکایتیں پیدا کر ڈالیں تھیں۔

رات دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔ میں کریم بیلے کی چھت پر نظریں جمائے خالی نظروں اور بوجھل دل سے بیٹھا رہا تھا۔ آج کوئی اوپر نہیں آیا تھا۔
”اسے اندھیرے میں اپنا خفیف سراپا بھی مجھ سے چھپانا ہو گا؟“
میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔

وہ سارے حق واپس لے چکی تھی۔ وہ جو اس نے ضد کر کے مجھے دیے تھے۔ اب بننا بتائے، بنا میرا حال جانے اس نے اپنے راستے الگ کر لیے تھے۔ میں بوجھل قدموں سے واپس آ گیا تھا۔ یقیناً آج میری آخری رات گزری تھی اس پارک میں۔ اسے میرا وجود وہاں بھی گوارا نہیں تھا، تو میں کیوں جاتا، کیوں خود کو ازارا کرتا؟

زندگی کب رنگ بدلتی ہے پتا ہی نہیں چلتا۔ مجھے میری نظروں میں معتبر بنانے والی نے پل بھر میں مرتضیٰ کی جھگی کا فقیر بنادیا تھا اور یہ جھوٹ نہیں تھا۔ خواب ٹوٹ چکے تھے کیونکہ آج میری آنکھ پوری طرح کھل چکی تھی۔ میں نے خود سے عہد کیا تھا کہ اب کبھی خواب نہیں دیکھوں گا۔ خواب بس سراپا ہوتے ہیں اور مجھے سراپوں کے پیچھے نہیں بھاگنا تھا۔ مجھے اپنی ماں کا بڑھاپا سنوارنا تھا، اسے ان کی زندگی کا سب سے خوبصورت وقت بنانا تھا، انہیں اپنے ہونے کا احساس دلانا تھا۔ میرے عہد و پیمان صرف اس سے نہیں ہوئے تھے، خود سے بھی ہوئے تھے۔ میں نے چشم تصور میں گھر کے کچے آنگن میں بیٹھی ماں کو دیکھا۔ مجھے کہانیاں سنا کر سنانے والی ماں۔ ایک خوب صورت اور جاندار رشتہ تو اب بھی میرے پاس تھا۔ میں کیونکر ناشکرا ہوتا۔ مجھے اس رشتے کے لیے خود کو وقف کرنا تھا۔ مجھے اس پل لگ رہا تھا میں نے سچے رشتے کی حقیقت جان لی ہے۔ میں نے زندگی کی حقیقت کو پالیا ہے۔ زندگی کی حقیقت یہی کہتی ہے کہ سچے رشتوں کو کبھی آنکھوں سے اوجھل مت ہونے دو۔ یہ ہیرے جو اہرات اور بڑے بڑے محلوں سے زیادہ قیمتی اور انمول ہوتے ہیں۔ مجھے ماں کے پاس واپس جانا تھا۔ دھاڑی کرنی تھی، اپنے باپ کی طرح اور خوشی خوشی شام کو واپس آ کر ماں کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھا کر سو جانا تھا۔ ماں سامنے ہو تو زندگی مکمل لگنے لگتی ہے۔ ماں مجھے دنیا میں رہنے والی کروڑوں ماؤں کا پتا نہیں تھا وہ کیسی ہوتی ہیں۔ پر میری ماں

میرے لیے صحرا میں کھڑے ہوئے اکلوتے پیڑ کی طرح تھی جو ہر وقت مجھے اپنی چھاؤں میں لینے کے لیے بے تاب رہتی تھی جسکی گود میں سر رکھتے ہی میرا ہر غم حرف غلط کی طرح مٹ جاتا تھا اور مائیں بھی تو یہی چاہتی ہیں کہ ان کے لخت جگر ان کی نظروں کے سامنے رہیں۔ کب چاہتی ہیں کہ ان دیکھے مستقبل کے لیے فانی زندگی کی بے لگام خواہشوں کے سرپٹ دوڑتے گھوڑے پر بیٹھ کر دنیا کی بھیڑ میں کہیں گم ہو جائیں۔ جیسے میں گم ہونے کے لیے آیا تھا، مگر صد شکر کہ کسی کی بے اعتنائی نے میری زندگی میں میری ماں کی اہمیت کو دوبالا کر دیا تھا۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا۔ آج مجھے مرتضیٰ کی نوکری آخری بار کرنی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اسے مخاطب کیا تھا۔

”آپ کا شکریہ میم صاب! اپنی سگت کے کچھ لمحے دان کرنے کے لیے، میں ان لمحوں کو سنبھال کر رکھوں گا۔“

☆...☆...☆

تین جنوری بروز منگل (2014ء)

صبح کے نو بج رہے تھے۔ کریم پیلس میں ہر طرف چہل پہل تھی۔ شہر بھر سے مہمانوں کی آمد و رفت ابھی سے شروع ہو چکی تھی۔ آج اس محل کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا کیونکہ آج رات بارہ بجے تاریخ بدلتے ہی رانی کے بیس سال مکمل ہو جانے تھے۔ سیٹھ کریم خود انتظامات میں مصروف تھے۔ ایک گرینڈ پارٹی دی جانے والی تھی۔ یہ پارٹی رانی کی سالگرہ کے علاوہ ایک اور بہت بڑے سرپرانز کے لیے بھی دی جا رہی تھی جس سے ابھی تک سیٹھ کریم کے خاندان کے لوگ اور دوست احباب سب انجان تھے، حتیٰ کہ ہمدانی صاحب بھی نہیں جانتے تھے جن سے سیٹھ کریم ہر بات شیر کرتے تھے۔ رانی کی ماں آج سولہ سال بعد اس گھر میں اپنی بیٹی کی بیسویں سالگرہ منانے کے لیے موجود تھی اور ایک اور ہستی جسے رانی کی زندگی میں سب سے خاص مقام حاصل ہو چکا تھا۔ وہ بھی رانی کی سالگرہ کی تیاریوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار پاکستان آیا تھا۔ اردو سے نابلد، پورا نام وقار الحسن، مگر اسے صرف وہی بلایا جاتا تھا۔

پیلس کا سیکنڈ فلور اور اس میں رانی کا وہ مخصوص کمرہ، اس کی جائے پناہ جہاں وہ دنیا سے فرار ہو کر جا چھپتی تھی اور تب تک چھپی رہتی جب تک اسے چھت کا وہ کونہ بلا نہ لیتا جہاں سے پیپل کا درخت اور اس کے نیچے بنا ہوا چھپر ہوٹل نظر آتا تھا۔ جہاں سے پارک میں پڑا ہوا ویران بچ نظر آتا تھا جسے اس نے کسی کے ساتھ مل کر آباد کر لیا تھا۔ ایک اجنبی کے ساتھ

، جسے اپنا مان کر اجنبی بلایا کرتی تھی وہ اور آج جب ہر طرف اس کے نام کی پکار پڑ رہی تھی۔ اس کی زندگی کے سب سے اہم پل کو اسپیشل اور یادگار بنانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں، وہ ان تمام تیاریوں سے بے نیاز اپنی جائے پناہ میں بے حس کھڑی آئینہ دیکھنے میں مصروف تھی۔ آئینے میں کھڑی اس کی پرچھائی جو کچھ عرصے کے لیے ہار مان کر کہیں گم ہو گئی تھی۔ آج پھر اپنی تمام تر تلخیوں سمیت وارد ہو چکی تھی۔ وہ اپنی پرچھائی کو گھور کر اپنی شرمندگی چھپانا چاہ رہی تھی، مگر آج اس کی آنکھیں اس کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھیں۔ وہ زیادہ دیر تک اس پر نظریں ٹکانہ سکی تھی۔

تب اس کا سر جھکتے دیکھ کر آئینے میں کھڑی اس کی پرچھائی نے جان لیا تھا وہ جو سر جھکائے کھڑی ہے جس کے ہونے سے میرا وجود قائم ہے۔ آج سر جھکا کر اپنی شکست کا خاموش اعلان کر رہی تھی۔

رانی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا ڈبڈباتی سرخ آنکھیں۔

”میں ہار گئی“۔

تم نے سچ کہا تھا، میرے ہاتھوں میں ایک بھی لکیر ایسی نہیں ہے جو مجھے میرے اپنوں تک لے جائے۔ میں کسی کی چاہتیں سمیٹنے کے لیے نہیں بنی ہوں، میں صرف تمہارے آگے سر

جھکا کر جینے کے لیے بنی ہوں۔ میں نے ایک بار تم سے ضد کی اور اس ایک ہی بار نے مجھے اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں سے زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

بہتے آنسوؤں کے ساتھ وہ اپنی عدالت میں کھڑی اعتراف جرم کر رہی تھی۔

اور کمرے کے در و دیوار کسی کے فلک شگاف قہقہوں سے گونج اٹھے تھے۔ اس نے لرز کر آئینے میں کھڑی پرچھائی سے نظریں چرائیں۔ وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ اس ہنسی میں اس کی جیت کا غور بھی شامل تھا۔

”تم تو پہلے سے برباد تھیں، مگر مجھ سے ضد باندھ کر تم نے ایک اور زندگی کو بھی جبر مسلسل بنا دیا ہے رانیہ کریم خان۔ وہ جو اب تک جون کی راتوں میں جی رہا ہے، وہ جو تمہارے لوٹ آنے کا انتظار کرتے کرتے لاش بن چکا ہے جس سے اب تم نظریں ملا پانے سے بھی گھبرا رہی ہو۔ وہ بھی آج برباد ہونے جا رہا ہے۔ وہ اب تک تمہارے کہے لفظوں میں جی رہا ہے، اپنے لفظ یاد ہیں تمہیں؟ جانے سے پہلے کیا کہہ گئیں تھیں اسے۔ تمہاری سانسوں کا تسلسل ہے وہ تمہارے جینے کی وجہ ہے وہ اور اس بھری دنیا میں تمہارا واحد اپنا ہے وہ جسے تم اجنبی بلا کر پکارتی ہو اور جو اس نام میں بھی اپنا پن پا کر ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔ اس کا کیا ہو گا؟“

پر چھائی کی ہنسی رک گئی تھی اور اس کی جگہ غصے نے لے لی تھی۔ وہ شعلہ بار نظروں سے رانی کو گھور رہی تھی، جواب طلب کر رہی تھی۔

رانی ارد گرد سے بے نیاز کھڑی اس کی باتیں سننے میں مگن تھی جب کوئی چپکے سے کمرے کا دروازہ کھول کر اس کے پیچھے آکھڑا ہوا تھا۔

وہ پر چھائی کی طرف دیکھ رہی تھی اور پر چھائی اس کے پیچھے کھڑے لمبے چوڑے وجود کو...

oh sweetie what are you doing here? come on girl today is the day of your life and you

وہ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کے بول رہا تھا۔

اور رانی اس کے ہاتھوں کے لمس سے بے نیاز پر چھائی کو تنکے جا رہی تھی، جواب طنزیہ نظروں سے کبھی اسے اور کبھی گورے چٹے کینیڈین کو دیکھ رہی تھی۔

اس نے خاموش کھڑی رانی کی نظروں کا پیچھا کرتے ہوئے آئینے کی طرف دیکھا اور مسکراتا ہوا بولا۔

”beautiful”

وہ ساکت کھڑی تھی جیسے کوئی لاش کھڑی اپنے جسم کو دیکھ رہی ہو۔

”infact beautiful princess”

وہ اس کی پر چھائی کو تنکتے ہوئے بولا تھا۔

”say something for me hunny”

پر چھائی سے اپنی خواہش کا اظہار کر رہا تھا۔ چاہتا تھا کہ وہ بھی اس کے لیے کچھ کہے۔

”یہ چاہتا ہے میں تمہارے لیے کچھ کہوں، کہہ دوں کیا؟”

پر چھائی رانی سے سوال کر رہی تھی۔

”کیا فرق پڑتا ہے؟”

رانی نے بے جان لہجے میں کہا تھا۔

”oh princess please say it again in english”

وہ اس کے لفظوں اور اس کے دل کی حالت سے انجان بنا کہہ رہا تھا۔

مگر وہ چپ چاپ پر چھائی کے سامنے کھڑی تھی۔ بس اس کے لیے۔

وہ کچھ دیر تک اس کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرتا رہا، مگر وہ ہنوز چپ کھڑی آئینہ دیکھ رہی تھی۔ تب وہ تھوڑا سا پریشان نظر آنے لگا۔

”is every thing ok princess?”

سوال کا جواب نہ پا کر وہ چند لمحوں تک اسے تنکٹا رہا اور پھر واپس مڑتے ہوئے کہہ گیا تھا۔

”i think you want me to leave”

اور دروازہ کھول کر چلا گیا۔ کریم پیلس کی رنگینوں میں شامل ہونے کے لیے۔
”سچ سامنے ہو اور ماننے کا حوصلہ نہ ہو“ تو انسان یوں ہی لاش کی طرح بے حس ہو جاتے ہیں
”۔

اس کی پرچھائی اسے بتلا کر اس کے لاش ہونے کا ثبوت دے رہی تھی۔

”نہیں... میرے اندر اب بھی احساس باقی ہے۔“

اس نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

”کیسا احساس؟“

پرچھائی نے تعجب سے اسے دیکھا تھا۔

”تم بے حس ہو چکی ہو رانیہ کریم خان، تم لاش بن چکی ہو۔ تمہارے لیے زندگی کے وہ تمام
دروازے بند ہو چکے ہیں جن سے داخل ہو کر تم زندگی کو محسوس کر سکتی تھیں۔ تم آج اپنے
اصل کی طرف لوٹ رہی ہو۔ اس اصل کی طرف، جسے تم نے کچھ دیر کے لیے فراموش کر
دیا تھا۔ تم ایک مردہ لڑکی ہو جو سانس لے سکتی ہے، مگر اس کا احساس نہیں کر سکتی۔

”نہیں... میرا احساس اب تک باقی ہے جو میرے پاس کسی کی امانت ہے۔ میں اس احساس
کے ساتھ اپنوں کی بنائی ہوئی قبر میں دفن نہیں ہو سکتی۔ مجھے اس کو لوٹانا ہو گا۔“

وہ دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتی ہوئی پرچھائی سے دور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ جیسے اسے چھوڑ کر
ہمیشہ کے لیے جا رہی ہو۔

☆...☆...☆

تین جنوری بروز منگل (2014ء)

میں آج آخری بار اس ہوٹل کی صبح دیکھ رہا تھا۔ میں نے مرتضیٰ کو بتا دیا تھا کہ کل میں واپس
چلا جاؤں گا۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا نہ کسی اور کو پڑنا تھا۔ کام کرتے ہوئے کئی دفعہ میں
نے کریم پیلس کی طرف دیکھا تھا۔ آج اس کی سچ دھج نرالی تھی اور اس سچ دھج کے پیچھے
چھپی وجہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔ کل اس رگ جاں کی سا لگرہ تھی جو اچانک انجان ہو گئی
تھی۔ شاید اسی لیے وہ واپس آئی تھی۔ اپنی سا لگرہ منانے اور اپنے ہم سفر کے ساتھ چلے جانا
تھا اسے شاید مجھے بتانے آئی تھی کہ اس نے کسی اور اپنے کو ڈھونڈ لیا ہے جو مجھ سے بھی زیادہ
اس کا اپنا ہو گیا تھا۔ میرا انتظار ختم کرنے آئی تھی وہ۔

مجھے اپنے گھر جانے کے لیے کل صبح کی پہلی گاڑی کا ٹکٹ کروانا تھا۔ مرتضیٰ بھی میرے ساتھ چلا آیا تھا۔ یہ اس کی دوسری اور آخری مہربانی تھی۔ پہلی مہربانی مجھے جون کی تپتی دوپہر میں سہراب گوٹھ سے اٹھا کر کرچکا تھا وہ۔ میں اس کی کھٹارہ موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھ کر اس شہر میں جنوری کی نرم گرم دھوپ میں بس سٹاپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ شہر آج بھی اتنا ہی اجنبی لگ رہا تھا جتنا میں نے آتے وقت محسوس کیا تھا۔ ٹکٹ بک کروا کر میں واپس آیا تو چھوٹو کو اپنا منتظر پایا۔ وہ بار بار بے چین نظروں سے میری طرف دیکھتا تھا مگر مرتضیٰ کی موجودگی میں کچھ کہنے سے گریز کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے میرے قریب آنے کا موقع ملا تو اتھل پھل ہوتی سانسوں کے ساتھ بولا تھا:

”بھاجی... میم صاب آئی تھیں آپ کے جانے کے بعد۔“

”کون سی میم صاب؟“

میں نے حیرت سے زیادہ بے چین ہو کر پوچھا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن یکخت بڑھ گئی تھی۔

”وہی بھاجی نکالی کار والی جس نے اپنے گھر کے سامنے ہمیں روک لیا تھا اور ایک بار چائے پینے بھی آئی تھی۔“

اس کے لفظوں نے میرے دل کی دنیا میں طوفان مچا دیا تھا۔

”کیوں... کس لیے کیا کہہ رہی تھی وہ؟“

میں نے بے قرار ہو کر چھوٹو کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑی ڈالا تھا۔

”وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں بھاجی۔ کہہ رہی تھیں آپ کا انتظار کریں گی آج رات بارہ بجے۔ میں نے پوچھا کہاں آنا ہے، تو بولی آپ کو پتا ہے کہاں آنا ہے۔“

چھوٹو بتاتا جا رہا تھا اور میری حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ آج کس لیے بلا رہی ہو گی؟ ساگرہ کا تحفہ دینے کے لیے؟ یا اس نئے رشتے کا بتانے کے لیے جو اس نے دیار غیر میں بنالیا تھا۔

میرا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا۔ آج رات کیا کہنے والی تھی وہ؟ پھر سے معافی تلافی؟ یا اپنی

کامیابی کے جشن میں شرکت کے لیے بلانا چاہ رہی تھی؟ آخر اب کیا چاہ رہی تھی وہ؟

میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے آج کی آخری رات اس کے پاس جانا چاہیے یا نہیں۔ کل تو میں نے ہمیشہ کے لیے چلے جانا تھا۔

دن سرکتا جا رہا تھا مگر آج مجھ پر ایک ایک لمحہ بھاری پڑ رہا تھا۔

”تو کیا میں آج رات اس کے پاس جانے والا ہوں؟“

میں نے خود کو ٹٹولا تھا۔

اور جواب پا کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔

میرے اندر کوئی تھا جو اس سے یوں اس طرح غیر ہو جانے کی وجہ پوچھنا چاہتا تھا جو اپنے انتظار کی شدتیں اسے بتانا چاہتا تھا جو آج پہلی بار اس سے شکایت کرنا چاہتا تھا۔ کوئی تھا جسے اب پتا چلا تھا کہ اس سے سوال و جواب کیے بغیر جانے کا فیصلہ درست نہیں ہے، تو کیا آج یوم حساب تھا؟ اس رشتے کا جو پل بھر میں بن گیا تھا اور پل بھر میں ٹوٹ گیا تھا۔ دن آخر کار گزر ہی گیا۔ رات کے دس بجے تک میری بے قراریاں اپنے نقطہ عروج پر پہنچ چکی تھیں۔

ٹھیک بارہ بجے میں مرتضیٰ اور چھوٹو کو سوتا ہوا چھوڑ کر کسی خود کار جذبے کے تحت پارک کی طرف رواں دواں تھا۔ کریم پیلس کے باہر گاڑیوں کی لمبی قطار دیکھ کر مجھے ہول اٹھنے لگے تھے۔ دور سے چمکتا دمکتا محل آج اپنے جو بن کی نرالی چھب دکھلا کر سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ میں گاڑیوں کی لمبی قطار سے بچتا بچتا پارک کی خاردار باڑھ کی طرف ہولیا تھا۔ تبھی میرے کانوں میں دور سے کسی کی غصیلی آواز سنائی دی۔

”کہاں گئیں ہیں وہ؟ گھر میں نہیں ہیں تو باہر ہی گئیں ہیں نا؟ تم گیٹ پر کھڑے سو رہے تھے کیا؟“

میں نے آواز کی سمت دیکھا۔ ادھ کھلے گیٹ پر اس کا باپ غصے سے لال پیلا ہو کر بوڑھے چوکیدار پر برس رہا تھا۔

میں نے تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ باڑھ پھلانگی۔ بچ خالی تھا۔ آج اس بچ پر بیٹھنا ممکن بھی نہیں تھا۔ کریم پیلس کے گیٹ پر کی گئی خصوصی لائننگ اس بچ کو بھی روشن کیے ہوئے تھی جو عام دنوں میں اندھیرے میں رہتا تھا۔ میں نے بچ کے پاس پہنچ کر بے تابی سے ادھر ادھر دیکھا۔ اور بچ سے کافی آگے پارک کے ایک تاریک کونے میں درخت کی آڑ میں کھڑی ایک لڑکی کو دیکھا۔

میں پہلی نظر میں پہچان نہیں پایا تھا۔

مگر اس یقین کے ساتھ کہ یہ وہی ہے۔ میں آگے بڑھ گیا۔

اور وہ وہی تھی۔

مجھے چاہتوں کے نئے سفر پر روانہ کر کے خود پیچھے ہٹ جانے والی، آج جانے کیا کہنے والی تھی۔

میں اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور مہران اسٹریٹ سے گزرتی ہوئی اکا دکا گاڑیاں دیکھ رہی تھی۔

میں اس کے عین پیچھے پہنچ چکا تھا۔

اس نے میری آہٹ پالی، مگر مڑ کر دیکھا نہیں تھا۔
میں اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے کان میرے دل کی دھڑکن کی گواہی دے رہے تھے۔
خاموش کھڑا میں اس کے مڑنے کا انتظار کرنے لگا۔
ڈھیر سارے پل یونہی گزر گئے۔
تب اس کی نرم و ملائم آواز جس میں چھپی ہوئی بے پناہ اپنائیت محسوس کر کے میرے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا پھنس گیا تھا۔
”ناراض ہوا اجنبی؟“
اس نے پیچھے مڑے بغیر کہا تھا۔
میں نے پوری کوشش کی تھی کہ میری آواز میرے جذبوں کی ترجمانی نہ کر سکے، مگر جذبے منہ زور ہوتے ہیں کہاں چھپ سکتے ہیں۔“
”نہیں...“
بھرائے ہوئے لہجے میں یہی ایک لفظ کہہ پایا تھا۔
تب وہ پیچھے مڑی۔
مجھے اس کی آنکھوں میں ویرانیاں ہی ویرانیاں نظر آئیں۔

اور پہلا سوال یہی اٹھا تھا ”یہ آج بھی ادھوری ہے؟“
”تمہیں ناراض ہونے کا پورا حق ہے اجنبی۔ مجھ سے خفا ہونے کا، مجھ پہر چلانے کا، مجھے برا بھلا کہنے کا تمہیں سب حق میں نے دل سے دیے ہیں اور ایک تمہیں ہی دیے ہیں۔“
میں خاموش کھڑا تھا، مگر الجھ رہا تھا۔ اس کے لہجے کی سچائیاں بتا رہی تھیں وہ برحق ہے۔
”کچھ کہو نا اجنبی، روٹھ کے دکھاؤ نا ناراض ہو جاؤ نا میں تمہیں منانا چاہتی ہوں۔ تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنا چاہتی ہوں۔“
وہ ترسی ہوئی آواز میں جیسے التجا کر رہی تھی، دونوں ہاتھ جوڑ کے مجھے دکھا رہی تھی۔
میں نے سر جھکا لیا تھا۔ پتا نہیں کیا تھا ان آنکھوں میں جنہیں میں سمجھ نہیں پارہا تھا اور دیکھنے کی ہمت بھی نہیں پڑ رہی تھی۔
”کیا آج بھی کچھ نہیں کہو گے؟ آج میری سالگرہ ہے اجنبی۔ آج مجھے تحفے میں تمہاری ناراضی چاہیے، میں تمہیں ناراض دیکھ کر مناؤں گی۔ تم پہلے انکار کرنا پھر میری منت سماجت کو قبول کر کے مان جانا۔ آج مان جانا اجنبی۔“
اس کی آواز میں بچوں کی سی ضد آگئی تھی اور ساتھ ہی اک عجیب سی تشنگی۔
میں مزید خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ شدت سے اٹھتے جذبات میری آواز میں خود بخود چلے آئے تھے۔

”ہاں ناراض ہوں میم صاب“ سخت ناراض ہوں۔ میں نے بھی آپ کی طرح زندگی میں پہلی بار کوئی رشتہ اپنی مرضی سے بنایا تھا اور دل کی گہرائیوں سے بنایا تھا۔ میں آپ کو سوچ سوچ کر جیتا ہوں میم صاب۔ میں جانتا ہوں میں آپ کے لائق نہیں۔ آپ آسمان کی بلندیوں پر تھیں اور میرے قدم زمین پر ٹکنے کے لائق بھی نہیں تھے۔ میں آپ کو کبھی پانہیں سکوں گا اس بات کا ادراک مجھے اچھی طرح تھا۔ گلہ یہ نہیں ہے کہ آپ نے سچ راستے میں مجھے چھوڑ دیا ہے۔ گلہ اس بات کا ہے کہ آپ نے مجھے بتانے لائق بھی نہیں سمجھا۔ میں آپ کا پہلا دوست تھا جسے آپ نے اپنی زندگی کا ہر ورق کھول کر دکھا دیا تھا تو یہ کیوں نہیں بتایا کہ اب آپ کو کوئی اور اپنا بھی مل گیا ہے۔ میں کبھی آپ کی خوشیوں کے راستے کا کاٹنا نہیں بن سکتا تھا میم صاب کیوں کہ میں نے آپ کو سچے دل سے پیار کیا تھا اور سچا پیار خوشیاں دینا جانتا ہے چھینتا نہیں۔ اکتیس دسمبر کی رات میری زندگی کی سب سے مشکل رات تھی۔ اس رات میں نے آپ کے اور اپنے بیچ حائل ایک اور ہستی کو دیکھا تھا اور پہلی بار دل میں آپ سے شکایت ہوئی تھی کہ آپ نے مجھے اس سے انجان کیوں رکھا؟“

میں نے گلوگیر لہجے میں دل میں آئی شکایت کو زبان دی تھی۔

اور وہ نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھی، میں چپ ہوا، تو ایک قدم اٹھا کر میرے اور قریب ہوئی۔

”معاف کر دو اجنبی۔“

اس نے ہاتھ جوڑے تھے۔

”تم نے کہا ماما کے پاس جاؤ، ان سے پوچھو۔ وہی سوال جس کا جواب پاپا نے تھپڑ مار کر دیا تھا۔ تم نے کہا تھا ضروری نہیں۔ ضروری نہیں کہ ان کی غلطی کی سزا صرف تم نے بھگتی ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے ان کے پاؤں تم سے زیادہ زخمی ہوں۔ تم نے کہا جاؤ ممکن ہے تمہاری ماں تمہارے راستے کے پتھر چنتے چنتے تھک گئی ہو اور میں مان گئی تھی مگر جب پاپا نے مجھے تھپڑ مارا تھا، تب میں ڈگمگا گئی۔ میں جن کی آنکھوں کے سامنے پل کر جوان ہوئی تھی وہی میری باتوں کو میرے دماغ کا خلل سمجھتے رہے۔ میرے اندر جھانک کر دیکھنا، تو درکنار میری زخمی روح کو تھپڑ کا تحفہ دے کر میری ساری غلط فہمیاں دور کر دی تھیں انہوں نے۔ تب میں تمہارے پاس آئی تھی اجنبی۔ نہیں جانا چاہتی تھی ماں کے پاس۔ کاش میں نہ آتی اس دن تمہارے پاس اور وہ سچے اور کھرے لفظ نہ سن پاتی جو تم نے میرے آنسوؤں کے عوض میری جھولی میں ڈال دیے تھے۔ تم نے کہا تھا ”میں آپ کو ہر قسم سے آزاد کرتا ہوں۔ میں آپ کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ آپ وہی کریں جو آپ چاہتی ہیں“

مجھے آج تک یہ الفاظ اتنی محبت سے کسی نے نہیں کہے تھے اجنبی۔ تم نے اسی دن مجھے پالیا تھا، میں تو اسی پل جب تم میری سسکیوں سے الجھ کر خود سسکنے لگے تھے۔ تمہاری بن چکی تھی ہمیشہ کے لیے اور میں نے فیصلہ کیا تھا، میں ماما سے آخری بار ملوں گی اور وہی کہوں گی جو میں نے پاپا سے کہا تھا۔

میں نے کہا اجنبی میں نے وہی سوال اپنی ماما سے کیا اور اس دن تم صحیح نکلے تھے۔ ماما نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور بے اختیار رو پڑی تھیں۔ انہوں نے اپنے سولہ سال کے سفر میں دہکنے والی پچھتاوے کی آگ کی تپش کو میرے دل تک پہنچا دیا تھا اور میں نے سچ مان لیا تھا۔ میں ان کے وجود سے ملنے والی محبت کی تیز لہر کے آگے بہ گئی تھی۔ میرے سارے گلے دھل گئے تھے، سارے سوال ختم ہو گئے تھے۔ میں نے آگے بڑھ خود سے آگے بڑھ کر ان کی پیاسی ممتا کو قبول کر لیا تھا۔ ہمارے شب و روز بالکل ایسے ہی ہو گئے تھے جیسے ایک دوسرے سے بے انتہا پیار کرنے والی ماں بیٹی کے ہوتے ہیں۔ وہ میرے سامنے اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھیں اور میں ان کی غیر موجودگی میں بھی اللہ کے حضور سجدہ ریز رہتی تھی۔ ماما کو میری ایک ایک عادت کا پتا چل گیا تھا۔ وہ میرے رت جگلوں کو اپنی توجہ اور پیار کے حصار میں قید کر کے مجھ سے کہیں دور لے گئیں تھیں اور میں ان کے پاس ان کی بانہوں کے ہالے میں بالکل ایسے ہی سو جایا کرتی تھی جیسے ننھے بچے ماں کے احساس کو پا کر نیند کی چادر

تان لیتے ہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا اجنبی۔ پاپا کے فون مسلسل آنے لگے تھے۔ وہ مجھے تھپڑ مار کر مجھ سے کہیں زیادہ ڈسٹرب ہو گئے تھے۔ بار بار معافی مانگتے تھے۔ تم مان سکتے ہو؟ میرے پاپا! سیٹھ کریم معافی مانگ رہے تھے۔ اپنی ساری غلطیاں تسلیم کر رہے تھے، مجھے اپنی کل کائنات مان رہے تھے اور کبھی کبھی ایسے بھیگے لفظ بولتے تھے کہ میں یقین نہیں کر پاتی تھی کہ وہ اپنے آنسوؤں سے مجھے اپنی سچائیاں دکھا رہے ہیں۔ میں فون پر ان کی آواز سن کر انہیں روز معاف کرتی تھی اور وہ روز اپنی نئی نئی غلطیاں ڈھونڈ کر ان کی تلافی کرنا شروع کر دیتے تھے۔ اس وقت میں سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی اجنبی کہ میں کتنی غلط تھی کہ میرے پاپا اور ماما مجھے نہیں سمجھتے۔ میری تنہائی کو دیکھ نہیں پاتے، میری تشنہ روح کی تڑپ محسوس نہیں کر سکتے۔ میں سچ مچ ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔ تمہیں بے طرح یاد کرنے لگی تھی۔ میں چاہتی تھی پلک جھپکتے ہی تمہارے پاس پہنچ جاؤں اور تمہیں بتاؤں کہ تم کتنے صحیح نکلے اور میں کتنی غلط۔

وہ کچھ پل کے لیے رکی تھی۔

میں نے اس کے جڑے ہاتھ کھولتے ہوئے اس کے خاموش ہوتے لب دیکھے تھے۔

وہ بول رہی تھی تو وقت رک گیا تھا۔ مجھے اپنے آس پاس کا ہوش نہ تھا۔ میں غافل تھا کہ میں اس لڑکی کے سامنے کھڑا ہوں جس کی سا لگرہ کی پارٹی کے لیے شہر بھر کے معززین کریم پیلس میں جمع ہو چکے تھے اور وہ گمشدہ ہو چکی تھی۔

اس نے تنے سے سر نکال لیا تھا۔ بھری بھری کالی آنکھیں جن میں ڈھیر سا راپانی جمع ہو چکا تھا۔ ”اور میں غلط نکل گئی اجنبی، میں غلط ثابت ہو گئی۔ دوسری بار غلط ثابت ہو گئی اور میری پرچھائی، میری پرچھائی سچی نکلی۔ تم بھی غلط نکلے سب غلط نکلے۔ بس میری پرچھائی۔ ایک وہی ہے جو مجھے ہر بار سچ بتاتی ہے، میں اس سچ کو مانتی ہوں۔ سچ کہتا تھا میں رانیہ کریم خان ہوں ہاں اجنبی، آج تمہیں بتا رہی ہوں کہ آج کے بعد تم اس نام کو میرے منہ سے کبھی سن نہیں پاؤ گے۔ میں رانیہ کریم خان، میری ماما مجھے رانی بلاتی ہیں۔ میں ان کی رانی ہوں، ان کی جنہوں نے اپنا نقصان اپنی رانی کو بیچ کر پورا کر لیا۔ اپنے بزنس پارٹنر کے بیٹے کے ہاتھ میں بیچ کر میری تصویریں میری ماما کے لیے جاتی تھیں، مگر انہیں دیکھ کر کوئی اور آنکھیں سینکتا تھا۔ وہ جو ہر رات کسی نہ کسی نائٹ کلب کی رونق بن کر جھومتا رہتا ہے، وہ جسے جسمانی آزادی کے علمبرداروں نے اپنا سالار مانا ہوا ہے۔ وہ مجھے پرنس کہتا ہے اور مجھ سے محبت کا دعوے دار ہے۔ بالکل ماما کی طرح اور پاپا کی طرح۔ میرے پاپا کی طرح جو مجھے کوئین کہتے ہیں۔ وہ بھی کینیڈا شفٹ ہو رہے ہیں۔ وکی کے پاپا نے انہیں مکمل سپورٹ کا یقین دلوا دیا

ہے۔ وہ وہاں کے بزنس ٹائیکون بننا چاہتے ہیں۔ کتنی خوبصورتی سے اپنی کوئین کا استعمال کیا تھا پاپا نے اجنبی۔ واقعی، مجھے ماننا پڑا۔ وہ مجھے ہوئے بزنس مین ہیں۔” اس کے نین کٹوروں سے آبشار بہنے لگے تھے۔

میرے دل کو کسی نے مٹھی میں قید کیا ہوا تھا، میری سانسیں اٹک رہی تھیں۔ اللہ امتحان لیتا ہے۔ ہمارے صبر کا امتحان پر اللہ والے کہتے ہیں اللہ اتنا ہی امتحان لیتا ہے، جتنا ہم برداشت کر سکتے ہیں۔ وہ برداشت کر رہی تھی مگر مجھ سے برداشت نہیں ہو پارہا تھا۔

”اجنبی میری پرچھائی کبھی غلط نہیں کہتی، وہ آج تک میرے سامنے خود کو درست ثابت کرتی آئی ہے۔ وہ جو کہتی ہے، ہو جاتا ہے۔ میں نے پہلی بار تمہارے لیے اس سے جنگ لڑی اور جانتے ہو اس جنگ نے مجھے کہاں پہنچا دیا؟” بے آواز روتے روتے وہ دھاڑ مار کر چیخی تھی۔

”اس جنگ نے مجھے ایک آوارہ، بدچلن اور وحشی کی آغوش میں دھکیل دیا اجنبی جو مجھے پرنس کہتا ہے، مگر راتیں اپنی کنیزوں کے ساتھ کاٹتا ہے۔ میں ہار گئی ہوں، میں سب کچھ ہار گئی ہوں اجنبی۔ میں تمہیں بھی ہار گئی ہوں۔”

وہ دھاڑیں مارتے ہوئے جھکنے لگی تھی اور میں پتھر کا بت بنا اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہل پا رہا تھا۔

تبھی اسے زور کی قے ہوئی۔

میں نے ہوش کی دنیا میں آتے ہوئے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا کیا تھا۔
اس کے ہونٹوں کے کناروں سے خون کی باریک لکیریں بہنے لگی تھیں۔ میں دہشت زدہ ہو
کر دو قدم پیچھے ہٹا تھا... میری آنکھیں پھٹ چکی تھیں۔

”آ... آپ ...“

کانپتے ہوئے ہونٹوں سے میں کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر اس نے آگے بڑھ کر میرے منہ پر ہاتھ
رکھ دیا۔

”مجھے بولنے دوا جنبی...“

مجھے اقرار کرنے دو کہ اس دنیا میں میرے ایسی زندہ لاشیں بھی ہوتی ہیں جو جینے کی وجہ
ڈھونڈتے ڈھونڈتے موت کے راستوں پر چل پڑتی ہیں۔ میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں، میں
تمہارے سنگ جینا چاہتی تھی۔ میں تمہاری الفتوں کی قرض دار بن کر تمہارے کچے گھر کے
تنگ و تاریک کمرے میں زندگی تمام کرنا چاہتی تھی۔ پر میں ڈر گئی ہوں، میں اپنی پر چھائی
سے ڈر گئی ہوں۔ وہ میرے ادھورے پن کو کبھی پورا نہیں ہونے دے گی۔ اپنے کہے
لفظوں کو سچ ثابت کرنے کے لیے تمہیں بھی مجھ سے جدا کر دے گی۔ پر اجنبی، میں وہ وقت
کبھی نہیں آنے دوں گی۔ میں اسے ہر ادوں گی، میں تمہاری آغوش میں دم توڑ کر اسے

شکست دوں گی۔ میں اس پہلی اور آخری لڑائی میں ہار نہیں مانوں گی۔ میں ہار نہیں مانوں
گی۔

وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح میرے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔

اس کے ہونٹوں سے بہتا خون...

اور آنکھوں میں چھائی موت کی زردی دیکھ کر میں نے وحشت سے آسمان کی طرف دیکھ کر
اسے پکارا تھا۔

کہ شاید میری دہائی آسمان کے ساتوں پر دوں کو چیرتی ہوئی اس تک پہنچ جائے۔

جو کہتا ہے، میں نے تمہیں زندگی انعام میں دی ہے۔

یہ کیسا انعام ہے؟ جسے پانے کے بعد ڈھونڈتے ڈھونڈتے موت آجاتی ہے۔

میرے آس پاس موت کا رقص جاری ہو چکا تھا۔

زندگی اب بھی ہار چکی تھی۔

موت نے اسے ہر ادیا تھا۔

اور یہ موت یونہی ہر اتی آئی ہے۔

اور ہر اتی رہے گی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔

www.pakistanipoint.com

☆...☆...☆

شہزادی ایک لکڑہارے کی آغوش میں اپنی جان دے چکی تھی۔
اور لکڑہارا....

لکڑہارے نے اپنی سانسیں لیتی لاش گھسیٹے ہوئے جنگل میں گم ہو جانا تھا۔
انسانوں کے جنگل میں...

☆...☆...☆

اختتام پذیر

